بسم اللہ الرحمٰن الرّحیم

رمضان المبارک اور رضائے الٰہی کا حصول

یہ شمارہ جب قارئین تک پہنچے گا تو رمضان المبارک کا پہلا عشرہ یعنی عشرۂ رحمت مکمل ہو چکا ہوگا۔ رمضان المبارک قمری سال کا نواں مہینہ ہے۔ یہ واحد مہینہ ہے جس کا نام قرآن مجید میں ملتا ہے‘ اس کے علاوہ کسی دوسرے مہینے کا نام قرآن پاک میں نہیں آیا۔ یہی وہ مہینہ ہے جس کے آخری عشرے کی طاق راتوں میں ایک ایسی رات بھی ہے جو ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ یہ نزولِ قرآن کی رات ہے‘ جسے قرآن نے لیلۃ القدر کہا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیا و رُسل کے مبارک اقوال اور چاروں الہامی کتابوں کے مندرجات ایک نکتہ کو فوکس کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک نہیں‘ وہ واحد خالق ہے‘ باقی سب اُس کی مخلوق ہے‘ وہ قوت و اقتدار کا واحد مالک اور عظمت و کبریائی کا واحد دعویدار ہے‘ باقی سب مخلوق اُس کی محتاج ہے۔ اُس کا قرب اور اُس کی رضا مخلوق کو عظمت اور عزت نوازتی ہے اور اُس سے دوری اور سرکشی ابدی ذلت و رسوائی اور نکبت کا باعث بنتی ہے۔ بہترین مثال یہ ہوگی کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور ابولہب کا حسب و نسب ایک تھا‘ اُن میں چچا بھتیجا کا رشتہ تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عبدِ کامل تھے۔ آپؐ کے ہر سانس میں یادِ الٰہی اور عشقِ الٰہی رچا بسا تھا۔ لہٰذا دنیا میں بھی وہ مقام پایا کہ انسانیت رشک کرتی ہے‘ اور آنجہاں میں آپ کا مقام کیا ہوگا‘ اس کا اندازہ اس سے لگائیں کہ اپنی حیاتِ طیبہ میں معراج کے سفر کے دوران آپؐ اُس مقام تک پہنچے جہاں جاتے ہوئے جبرائیل علیہ السلام کے بھی پر جلتے تھے‘ جبکہ آپؐ ہی کا چچا بدبخت ابولہب ذلت و رسوائی کی موت مرا۔ ایسی خوفناک بیماری میں مبتلا ہوا کہ اہل خانہ اُسے اکیلا چھوڑ کر گھر سے چلے گئے اور اہل محلّہ نے لمبی لمبی لکڑیوں سے دھکیل کر اُسے قبر رسید کیا۔

قرآن کیوں انتہائی مقدس و مکرم ہے؟ ظاہر ہے صرف اور صرف اس لیے کہ یہ اللہ ربّ العزت کے بول ہیں‘ یہ اُس کا کلام ہے‘ اس لیے مبارک اور قابلِ احترام ہے۔ رمضان بھی دوسرے قمری مہینوں کی طرح ایک مہینہ ہے‘ لیکن یہ اس لیے فضیلت حاصل کر گیا کہ اللہ کا مقدس کلام اس ماہ کی ایک رات کو آسمانِ دنیا پر نازل ہوا اور وہ رات اسی بنا پر ہزار مہینوں سے بڑھ گئی۔ (یاد رہے ہزار مہینے آج کل ایک آدمی کی اوسط عمر سے بھی زیادہ ہیں) ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ابدی عزت‘ عظمت‘ تکریم اور بڑائی اللہ ربّ العزت سے نسبت قائم کرنے سے میسر آتی ہے۔ ذاتِ باری تعالیٰ کو نہ کسی نے دیکھا نہ سر کی

آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے۔ ہماری قسمت ایسی نہ تھی کہ ہمیں رسولِ مقبولﷺ کا دیدار ہوتا۔ وہ جن کا مقدر تھا اُن ہی کا تھا۔ وہ صحابی کا درجہ پا گئے کہ یہ بھی مالکِ کائنات کا فیصلہ تھا کہ صرف اُسے فیصلہ کرنے کا حق ہے۔ ہمارے پاس اللہ سے تعلق اور نسبت قائم کرنے کے لیے یہ پاک کلام ہی تو ہے (یاد رہے حدیث رسول بھی تو تفسیر قرآن ہے) حق تو یہ ہے کہ بارہ ماہ اس سے چمٹے رہیں، اسے پڑھیں، اس سے رہنمائی حاصل کریں، اس کی تقلید کریں، اس کے حلال کردہ کو جائز سمجھیں اور اس کے حرام سے منہ موڑ لیں، اور رمضان کا مہینہ تو اسی کے لیے وقف کر دیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ آپ کا کلامِ الٰہی سے ایسا تعلق قائم ہو جائے گا کہ باقی گیارہ ماہ بھی آپ اس کی تلاوت کرتے رہیں گے اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق اس سے مستفید بھی ہوتے رہیں گے۔

ماہِ رمضان کے حوالے سے ایک وضاحت بہت ضروری ہے۔ بعض دینی رجحان رکھنے والے لوگ نیک نیتی سے یہ طے کر لیتے ہیں کہ وہ اس ماہ کو صرف عبادت کے لیے مخصوص کر لیں گے اور دوسرا کوئی دینی یا دنیوی کام نہیں کریں گے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس میں قطعی طور پر کوئی حرج نہیں اگر آپ صحیح معنوں میں اسلامی فلاحی ریاست کے شہری ہیں، ریاست اپنے شہریوں کی دیکھ بھال کا فریضہ ادا کر رہی ہے اور آپ بھی خود کو ایک ماہ کے لیے روزگارِ زندگی سے فارغ کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر یہ آئیڈیل صورت حال نہیں ہے تو ماہِ رمضان ہمیں اقامت دین کی جدوجہد سے یا رزقِ حلال کمانے سے روکتا نہیں۔ ظاہر ہے یہاں بھی ہمیں حضورﷺ کی مبارک سیرت سے رہنمائی حاصل کرنا ہوگی۔ آپؐ کی حیاتِ طیبہ میں نو بار رمضان کا مبارک مہینہ آیا۔ آپ نے یہ رمضان جنگ وجدل میں بھی گزارے، جنگوں کی تیاری میں بھی گزارے، انتظامی معاملات بھی انتہائی احسن طریقے سے سرانجام دیتے رہے، اور ۱۰ھ کے رمضان میں جب امن وسکون تھا تو آپ نے پورا رمضان المبارک اعتکاف کی حالت میں گزار کر یادِ الٰہی میں بھی ہمہ تن مصروف رہے۔ سیرتِ نبویؐ سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ہم اپنی منصوبہ بندی حالات واحوال کے حوالے سے کریں۔ آج دشمنانِ اسلام مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانا چاہتے ہیں۔ لہٰذا ہمارا فرض ہے کہ ہم اس ماہ میں قرآن سے اپنا جو تعلق تازہ کریں اُس میں ہم غور وخوض کریں کہ ان کا مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے اور ہم قرآن کے مطلوبہ افراد کیسے بن سکتے ہیں۔ کیونکہ قرآن کے مطلوبہ افراد ہی مل کر اسلامی فلاحی ریاست قائم کر سکیں گے۔ طاغوتی نظام کی چھتری تلے شب وروز گزارتے ہوئے رضائے الٰہی کا حصول ناممکن ہے۔ آپ اگر طاغوتی نظام کے خلاف کسی بھی سطح پر صف آرا ہیں تو گویا آپ رضائے الٰہی کے حصول کی جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ اس لئے کہ رضائے الٰہی ہی مقصود ومطلوب ہے، وگرنہ سب رسوم ورواج ہیں، سب بیکار کی بھاگ دوڑ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس مبارک ماہ کی وساطت سے اپنی رضا حاصل کرنے کی توفیق دے کہ یہی انسانی زندگی کی معراج ہے اور بہترین ثمر ہے۔ ○○

سُورۃُ النِّساء

آیات ۱۵۔۲۲

﴿وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ فَاسۡتَشۡہِدُوۡا عَلَیۡہِنَّ اَرۡبَعَۃً
مِّنۡکُمۡ ۚ فَاِنۡ شَہِدُوۡا فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ فِی الۡبُیُوۡتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰہُنَّ الۡمَوۡتُ
اَوۡ یَجۡعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیۡلًا ﴿۱۵﴾ وَالَّذٰنِ یَاۡتِیٰنِہَا مِنۡکُمۡ فَاٰذُوۡہُمَا ۚ فَاِنۡ تَابَا
وَاَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡہُمَا ؕ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ تَوَّابًا رَّحِیۡمًا ﴿۱۶﴾ اِنَّمَا التَّوۡبَۃُ
عَلَی اللّٰہِ لِلَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَہَالَۃٍ ثُمَّ یَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِیۡبٍ
فَاُولٰٓئِکَ یَتُوۡبُ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ ؕ وَکَانَ اللّٰہُ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ﴿۱۷﴾ وَلَیۡسَتِ
التَّوۡبَۃُ لِلَّذِیۡنَ یَعۡمَلُوۡنَ السَّیِّاٰتِ ۚ حَتّٰۤی اِذَا حَضَرَ اَحَدَہُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ
اِنِّیۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ وَلَا الَّذِیۡنَ یَمُوۡتُوۡنَ وَہُمۡ کُفَّارٌ ؕ اُولٰٓئِکَ اَعۡتَدۡنَا لَہُمۡ
عَذَابًا اَلِیۡمًا ﴿۱۸﴾ یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ
کَرۡہًا ؕ وَلَا تَعۡضُلُوۡہُنَّ لِتَذۡہَبُوۡا بِبَعۡضِ مَاۤ اٰتَیۡتُمُوۡہُنَّ اِلَّاۤ اَنۡ یَّاۡتِیۡنَ
بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ ۚ وَعَاشِرُوۡہُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۚ فَاِنۡ کَرِہۡتُمُوۡہُنَّ فَعَسٰۤی
اَنۡ تَکۡرَہُوۡا شَیۡئًا وَّیَجۡعَلَ اللّٰہُ فِیۡہِ خَیۡرًا کَثِیۡرًا ﴿۱۹﴾ وَاِنۡ اَرَدۡتُّمُ
اسۡتِبۡدَالَ زَوۡجٍ مَّکَانَ زَوۡجٍ ۙ وَّاٰتَیۡتُمۡ اِحۡدٰىہُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡہُ
شَیۡئًا ؕ اَتَاۡخُذُوۡنَہٗ بُہۡتَانًا وَّاِثۡمًا مُّبِیۡنًا ﴿۲۰﴾ وَکَیۡفَ تَاۡخُذُوۡنَہٗ وَقَدۡ اَفۡضٰی
بَعۡضُکُمۡ اِلٰی بَعۡضٍ وَّاَخَذۡنَ مِنۡکُمۡ مِّیۡثَاقًا غَلِیۡظًا ﴿۲۱﴾ وَلَا تَنۡکِحُوۡا مَا
نَکَحَ اٰبَآؤُکُمۡ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ اِنَّہٗ کَانَ فَاحِشَۃً وَّمَقۡتًا ؕ
وَسَآءَ سَبِیۡلًا ﴿۲۲﴾

اب اسلامی معاشرے کی تطہیر کے لیے احکام دیے جا رہے ہیں۔ مسلمان جب تک مکہ میں تھے تو وہاں کفار کا غلبہ تھا۔ اب مدینہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو وہ حیثیت دی ہے کہ اپنے معاملات کو سنوارنا شروع کریں۔ چنانچہ ایک ایک کر کے ان معاشرتی معاملات اور سماجی مسائل کو زیر بحث لایا جا رہا ہے۔ اسلامی معاشرے میں عفت و عصمت کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ لہٰذا اگر معاشرے میں جنسی بے راہ روی موجود ہے تو اس کی روک تھام کیسے ہو؟ اس کے لیے ابتدائی احکام یہاں آ رہے ہیں۔ اس ضمن میں تکمیلی احکام سورۃ النور میں آئیں گے۔ معاشرتی معاملات کے ضمن میں احکام پہلے سورۃ النساء' پھر سورۃ الاحزاب' پھر سورۃ النور اور پھر سورۃ المائدۃ میں بتدریج آئے ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا ہے کہ سورۃ الاحزاب اور سورۃ النور کو مصحف میں کافی آگے رکھا گیا ہے اور یہاں پر سورۃ النساء کے بعد سورۃ المائدۃ آ گئی ہے۔

آیت ۱۵ ﴿وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ﴾ ''اور تمہاری عورتوں میں سے جو کسی بے حیائی کا ارتکاب کریں''

﴿فَاسۡتَشۡہِدُوۡا عَلَیۡہِنَّ اَرۡبَعَۃً مِّنۡکُمۡ ۚ﴾ ''تو اُن پر اپنے میں سے چار گواہ لاؤ۔''

﴿فَاِنۡ شَہِدُوۡا فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ فِی الۡبُیُوۡتِ﴾ ''پس اگر وہ گواہی دے دیں تو ان عورتوں کو گھروں میں بند کر دو''

﴿حَتّٰی یَتَوَفّٰہُنَّ الۡمَوۡتُ﴾ ''یہاں تک کہ موت ان کو لے جائے''

اسی حالت میں ان کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔

﴿اَوۡ یَجۡعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیۡلًا ﴿۱۵﴾﴾ ''یا اللہ ان کے لیے کوئی اور راستہ نکال دے۔''

بدکاری کے متعلق یہ ابتدائی حکم تھا۔ بعد میں سورۃ النور میں حکم آ گیا کہ بدکاری کرنے والے مرد و عورت دونوں کو سو سو کوڑے لگائے جائیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں ایسی لڑکیوں یا عورتوں کا تذکرہ ہے جو مسلمانوں میں سے تھیں مگر ان کا بدکاری کا معاملہ کسی غیر مسلم مرد سے ہو گیا جو اسلامی معاشرے کے دباؤ میں نہیں ہے۔ ایسی عورتوں کے متعلق یہ ہدایت فرمائی گئی کہ انہیں تاحکم ثانی گھروں کے اندر محبوس رکھا جائے۔

آیت ۱۶ ﴿وَالَّذٰنِ یَاۡتِیٰنِہَا مِنۡکُمۡ فَاٰذُوۡہُمَا﴾ ''اور جو دونوں تم میں سے اس

(بدکاری) کا ارتکاب کریں تو ان دونوں کو ایذا پہنچاؤ۔''

اگر بدکاری کا ارتکاب کرنے والے مرد و عورت دونوں مسلمانوں میں سے ہی ہوں تو دونوں کو اذیت دی جائے۔یعنی ان کی توہین و تذلیل کی جائے اور مار اپیٹا جائے۔

﴿فَاِنۡ تَابَا وَاَصۡلَحَا فَاَعۡرِضُوۡا عَنۡهُمَا ؕ﴾ ''پھر اگر وہ توبہ کرلیں اور اصلاح کر لیں تو ان کو چھوڑ دو۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِيۡمًا ﴿۱۶﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ بہت توبہ قبول فرمانے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''

واضح رہے کہ یہ بالکل ابتدائی احکام ہیں۔اسی لیے ان کی وضاحت میں تفسیروں میں بہت سے اقوال مل جائیں گے۔اس لیے کہ جب حدود نافذ ہوگئیں تو یہ عبوری اور عارضی احکام منسوخ قرار پائے۔جیسے کہ سورۃ النساء میں قانونِ وراثت نازل ہونے کے بعد سورۃ البقرۃ میں واردشدہ وصیت کا حکم ساقط ہوگیا۔

آیت ۱۷ ﴿اِنَّمَا التَّوۡبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السُّوۡٓءَ بِجَهَالَةٍ﴾ ''اللہ کے ذمے ہے توبہ قبول کرنا ایسے لوگوں کی جو کوئی بری حرکت کر بیٹھتے ہیں جہالت اور نادانی میں''

﴿ثُمَّ يَتُوۡبُوۡنَ مِنۡ قَرِيۡبٍ﴾ ''پھر جلد ہی توبہ کر لیتے ہیں''

ایک صاحبِ ایمان پر کبھی ایسا وقت بھی آ سکتا ہے کہ خارجی اثرات اتنے شدید ہو جائیں یا نفس کے اندر کا ہیجان اسے جذبات سے مغلوب کر دے اور وہ کوئی گناہ کا کام کر گزرے۔لیکن اس کے بعد اسے جیسے ہی ہوش آئے گا اس پر شدید ندامت طاری ہو جائے گی اور وہ اللہ کے حضور توبہ کرے گا۔ایسے شخص کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اس کی توبہ قبول کرنا اللہ کے ذمے ہے۔

﴿فَاُولٰٓئِكَ يَتُوۡبُ اللّٰهُ عَلَيۡهِمۡ ؕ﴾ ''تو یہی ہیں جن کی توبہ اللہ قبول فرمائے گا۔''

﴿وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيۡمًا حَكِيۡمًا ﴿۱۷﴾﴾ ''اور اللہ تعالیٰ باخبر ہے اور حکیم و دانا ہے۔''

آیت ۱۸ ﴿وَلَيۡسَتِ التَّوۡبَةُ لِلَّذِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ السَّيِّاٰتِ﴾ ''اور ایسے لوگوں کا کوئی حق نہیں ہے توبہ کا جو برے کام کیے چلے جاتے ہیں۔''

مسلسل حرام خوریاں کرتے رہتے ہیں' زندگی بھر عیش اُڑاتے رہتے ہیں۔

﴿حَتّٰۤی اِذَا حَضَرَ اَحَدَھُمُ الۡمَوۡتُ قَالَ اِنِّیۡ تُبۡتُ الۡـٰٔنَ﴾ ''یہاں تک کہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آ جاتا ہے تو اُس وقت وہ کہتا ہے کہ اب میں توبہ کرتا ہوں''

﴿وَلَا الَّذِیۡنَ یَمُوۡتُوۡنَ وَھُمۡ کُفَّارٌ﴾ ''اور نہ ان لوگوں کی توبہ ہے جو کفر کی حالت میں ہی مر جاتے ہیں۔''

ان کی توبہ کا کوئی سوال ہی نہیں۔

﴿اُولٰٓئِکَ اَعۡتَدۡنَا لَھُمۡ عَذَابًا اَلِیۡمًا﴿۱۸﴾﴾ ''ایسے لوگوں کے لیے تو ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔''

آیت ۱۹ ﴿یٰۤاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا یَحِلُّ لَکُمۡ اَنۡ تَرِثُوا النِّسَآءَ کَرۡھًا﴾ ''اے اہل ایمان! تمہارے لیے جائز نہیں کہ تم عورتوں کو زبردستی وراثت میں لے لو۔''

یہ بھی عرب جاہلیت کی ایک مکروہ رسم تھی جس میں عورتوں کے طبقے پر شدید ظلم ہوتا تھا۔ ہوتا یوں تھا کہ ایک شخص فوت ہوا ہے' اس کی چار پانچ بیویاں ہیں' تو اس کا بڑا بیٹا وارث بن گیا ہے۔ اب اس کی حقیقی ماں تو ایک ہی ہے' باقی سوتیلی مائیں ہیں' تو وہ ان کو وراثت میں لے لیتا تھا کہ یہ میرے قبضے میں رہیں گی' بلکہ ان سے شادیاں بھی کر لیتے تھے یا بغیر نکاح اپنے گھروں میں ڈالے رکھتے تھے' یا پھر یہ کہ اختیار اپنے ہاتھ میں رکھ کر ان کی شادیاں کہیں اور کرتے تھے تو مہر خود لے لیتے تھے۔ چنانچہ فرمایا کہ اے اہل ایمان' تمہارے لیے جائز نہیں ہے کہ تم عورتوں کے زبردستی وارث بن بیٹھو! جس عورت کا شوہر فوت ہو گیا وہ آزاد ہے۔ عدت گزار کر جہاں چاہے جائے اور جس سے چاہے نکاح کر لے۔

﴿وَلَا تَعۡضُلُوۡھُنَّ لِتَذۡھَبُوۡا بِبَعۡضِ مَاۤ اٰتَیۡتُمُوۡھُنَّ﴾ ''اور نہ یہ جائز ہے کہ تم انہیں روکے رکھو تا کہ تم ان سے واپس لے لو اس کا کچھ حصہ جو کچھ تم نے ان کو دیا ہے''

نکاح کے وقت تو بڑے چاؤ تھے' بڑے لاڈ اٹھائے جا رہے تھے اور کیا کیا دے دیا تھا' اور اب وہ سب واپس ہتھیانے کے لیے طرح طرح کے ہتھکنڈے استعمال ہو رہے ہیں' انہیں تنگ کیا جا رہا ہے' ذہنی طور پر تکلیف پہنچائی جا رہی ہے۔

﴿اِلَّاۤ اَنۡ یَّاۡتِیۡنَ بِفَاحِشَۃٍ مُّبَیِّنَۃٍ﴾ ''ہاں اگر وہ صریح بدکاری کی مرتکب ہوئی

ہوں (تو تمہیں ان کو تنگ کرنے کا حق ہے)۔''

اگر کسی سے صریح حرام کاری کا فعل سرزد ہو گیا ہو اور اس پر اسے کوئی سزا دی جائے (جیسے کہ اوپر آ چکا ہے فَاٰذُوۡهُمَا) اس کی تو اجازت ہے۔ اس کے بغیر کسی پر زیادتی کرنا جائز نہیں ہے۔ خاص طور پر اگر نیت یہ ہو کہ میں اس سے اپنا مہر واپس لے لوں' یہ انتہائی کمینگی ہے۔

﴿وَعَاشِرُوۡهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ ۚ﴾ ''اور عورتوں کے ساتھ اچھے طریقے پر معاشرت اختیار کرو۔''

ان کے ساتھ بھلے طریقے پر' خوش اسلوبی سے' نیکی اور راستی کے ساتھ گزر بسر کرو۔

﴿فَاِنۡ كَرِهۡتُمُوۡهُنَّ فَعَسٰۤى اَنۡ تَكۡرَهُوۡا شَيۡـًٔـا وَّيَجۡعَلَ اللّٰهُ فِيۡهِ خَيۡرًا كَثِيۡرًا ﴿۱۹﴾﴾ ''اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو بعید نہیں کہ ایک چیز تمہیں ناپسند ہو اور اس میں اللہ نے تمہارے لیے بہت کچھ بہتری رکھ دی ہو۔''

اگر تمہیں کسی وجہ سے اپنی عورتیں ناپسند ہو گئی ہوں تو ہو سکتا ہے کہ کسی شے کو تم ناپسند کرو' درآنحالیکہ اللہ نے اسی میں تمہارے لیے خیر کثیر رکھ دیا ہو۔ ایک عورت کسی ایک اعتبار سے آپ کے دل سے اُتر گئی ہے' طبیعت کا میلان نہیں رہا ہے' لیکن پتا نہیں اس میں اور کون کون سی خوبیاں ہیں اور وہ کس کس اعتبار سے آپ کے لیے خیر کا ذریعہ بنتی ہے۔ تو اس معاملے کو اللہ کے حوالے کرو' اور ان کے حقوق ادا کرتے ہوئے' ان کے ساتھ خوش اسلوبی سے گزر بسر کرو۔ البتہ اگر معاملہ ایسا ہو گیا ہے کہ ساتھ رہنا ممکن نہیں ہے تو طلاق کا راستہ کھلا ہے' شریعت اسلامی نے اس میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ یہ مسیحیت کی طرح کا کوئی غیر معقول نظام نہیں ہے کہ طلاق ہو ہی نہیں سکتی۔

آیت ۲۰ ﴿وَاِنۡ اَرَدۡتُّمُ اسۡتِبۡدَالَ زَوۡجٍ مَّكَانَ زَوۡجٍ ۙ﴾ ''اور اگر تمہارا ارادہ ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے کا ہو''

اگر تم نے فیصلہ کر ہی لیا ہو کہ ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانی ہے۔

﴿وَّاٰتَيۡتُمۡ اِحۡدٰٮهُنَّ قِنۡطَارًا﴾ ''اور ان میں سے کسی ایک کو تم نے ڈھیروں مال دیا ہو''

﴿فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْـًٔا ؕ﴾ ''تو اس میں سے کوئی بھی شے واپس نہ لو۔''

عورتوں کو تم نے جو مہر دیا تھا وہ ان کا ہے' اب اس میں سے کچھ واپس نہیں لے سکتے۔

﴿اَتَاْخُذُوْنَهٗ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿٢٠﴾﴾ ''کیا تم اسے واپس لو گے بہتان لگا کر اور صریح گناہ کے مرتکب ہو کر؟''

آیت ۲۱ ﴿وَكَيْفَ تَاْخُذُوْنَهٗ وَقَدْ اَفْضٰى بَعْضُكُمْ اِلٰى بَعْضٍ﴾ ''اور تم اسے کیسے واپس لے سکتے ہو جبکہ تم ایک دوسرے کے ساتھ صحبت کر چکے ہو؟''

کچھ عقل کے ناخن لو' کچھ شعور اور شرافت کا ثبوت دو۔ تم ان سے وہ مال کس طرح واپس لینا چاہتے ہو جبکہ تمہارے مابین دنیا کا انتہائی قریبی تعلق قائم ہو چکا ہے۔

﴿وَّاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ﴿٢١﴾﴾ ''اور وہ تم سے مضبوط قول و قرار لے چکی ہیں۔''

یہ قول و قرار نکاح کے وقت ہوتا ہے جب مرد عورت کے مہر و نفقہ کی پوری ذمہ داری لیتا ہے۔

آیت ۲۲ ﴿وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ ''اور جن عورتوں سے تمہارے باپ نکاح کر چکے ہوں ان سے تم نکاح مت کرو''

جیسا کہ پہلے ذکر ہوا' ایامِ جاہلیت میں سوتیلی ماؤں کو نکاح کر کے یا بغیر نکاح کے گھر میں ڈال لیا جاتا تھا۔ ایسے نکاح کو اُس معاشرے میں بھی ''نکاحِ مقت'' کہا جاتا تھا۔ یعنی یہ بہت ہی برا نکاح ہے۔ ظاہر ہے فطرتِ انسانی تو ایسے تعلق سے اِبا کرتی ہے' مگر ان کے ہاں یہ رواج تھا۔ قرآن مجید نے اس مقام پر اس کا سختی سے سدّ باب کیا ہے۔

﴿اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ﴾ ''سوائے اس کے جو ہو چکا۔''

﴿اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ﴾ ''یقیناً یہ بڑی بے حیائی کی بات ہے اور اللہ تعالیٰ کے غضب کو بھڑکانے والی ہے۔''

﴿وَسَآءَ سَبِيْلًا ﴿٢٢﴾﴾ ''اور بہت ہی برا راستہ ہے۔''

اگلی آیت میں محرماتِ ابدیہ کا بیان ہے کہ کن رشتوں میں نکاح کا معاملہ نہیں ہو سکتا۔ یعنی ایک مرد اپنی کن کن رشتہ دار خواتین سے شادی نہیں کر سکتا۔

آیات ۲۳ تا ۲۵

﴿حُرِّمَتۡ عَلَیۡکُمۡ اُمَّهٰتُکُمۡ وَبَنٰتُکُمۡ وَاَخَوٰتُکُمۡ وَعَمّٰتُکُمۡ وَخٰلٰتُکُمۡ
وَبَنٰتُ الۡاَخِ وَبَنٰتُ الۡاُخۡتِ وَاُمَّهٰتُکُمُ الّٰتِیۡۤ اَرۡضَعۡنَکُمۡ وَاَخَوٰتُکُمۡ مِّنَ
الرَّضَاعَةِ وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِکُمۡ وَرَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیۡ فِیۡ حُجُوۡرِکُمۡ مِّنۡ
نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیۡ دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ ۫ فَاِنۡ لَّمۡ تَکُوۡنُوۡا دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ
عَلَیۡکُمۡ ۫ وَحَلَآئِلُ اَبۡنَآئِکُمُ الَّذِیۡنَ مِنۡ اَصۡلَابِکُمۡ ۙ وَاَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَیۡنَ
الۡاُخۡتَیۡنِ اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ۲۳
وَّالۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ۚ کِتٰبَ اللّٰهِ عَلَیۡکُمۡ ۚ
وَاُحِلَّ لَکُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمۡ اَنۡ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِکُمۡ مُّحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ
مُسٰفِحِیۡنَ ؕ فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ فَرِیۡضَةً ؕ وَلَا
جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ فِیۡمَا تَرٰضَیۡتُمۡ بِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡفَرِیۡضَةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ کَانَ
عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ۲۴ وَمَنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ مِنۡکُمۡ طَوۡلًا اَنۡ یَّنۡکِحَ
الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ فَمِنۡ مَّا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ مِّنۡ فَتَیٰتِکُمُ
الۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاِیۡمَانِکُمۡ ؕ بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ فَانۡکِحُوۡهُنَّ
بِاِذۡنِ اَهۡلِهِنَّ وَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ مُحۡصَنٰتٍ غَیۡرَ مُسٰفِحٰتٍ
وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحۡصِنَّ فَاِنۡ اَتَیۡنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَیۡهِنَّ نِصۡفُ
مَا عَلَی الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ ؕ ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ الۡعَنَتَ مِنۡکُمۡ ؕ
وَاَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۲۵﴾

آیت ۲۳ ﴿حُرِّمَتۡ عَلَیۡکُمۡ اُمَّهٰتُکُمۡ وَبَنٰتُکُمۡ وَاَخَوٰتُکُمۡ﴾ ”حرام کر دی گئیں تم پر تمہاری مائیں اور تمہاری بیٹیاں اور تمہاری بہنیں“

﴿وَعَمّٰتُکُمۡ وَخٰلٰتُکُمۡ﴾ ”اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں“

﴿وَبَنٰتُ الۡاَخِ وَبَنٰتُ الۡاُخۡتِ﴾ ''اور تمہاری بھتیجیاں اور بھانجیاں''

﴿وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِىۡۤ اَرۡضَعۡنَكُمۡ﴾ ''اور تمہاری وہ مائیں جنہوں نے تمہیں دودھ پلایا ہے''

﴿وَاَخَوٰتُكُمۡ مِّنَ الرَّضَاعَةِ﴾ ''اور تمہاری دودھ شریک بہنیں''

﴿وَاُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمۡ﴾ ''اور تمہاری بیویوں کی مائیں''

جن کو ہم ساس یا خوش دامن کہتے ہیں۔

﴿وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِىۡ فِىۡ حُجُوۡرِكُمۡ﴾ ''اور تمہاری ربیبائیں جو تمہاری گودوں میں پلی بڑھی ہوں''

﴿مِّنۡ نِّسَآئِكُمُ الّٰتِىۡ دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ﴾ ''تمہاری اُن بیویوں سے جن کے ساتھ تم نے مقاربت کی ہو''

﴿فَاِنۡ لَّمۡ تَكُوۡنُوۡا دَخَلۡتُمۡ بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡكُمۡ﴾ ''اور اگر تم نے ان بیویوں سے مقاربت نہ کی ہو تو تم پر کچھ گناہ نہیں''

''ربیبہ'' بیوی کی اُس لڑکی کو کہا جاتا ہے جو اس کے سابق شوہر سے ہو۔ اگر موجودہ شوہر اس بیوی سے تعلق زن وشو قائم ہونے کے بعد اس کو طلاق دے دے تو ربیبہ کو اپنے نکاح میں نہیں لا سکتا' یہ اس کے لیے حرام ہے۔ لیکن اگر اس بیوی کے ساتھ تعلق زن وشو قائم نہیں ہوا اور اسے طلاق دے دی تو پھر ربیبہ کے ساتھ نکاح ہو سکتا ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ اگر تم نے ان بیویوں کے ساتھ مقاربت نہ کی ہو تو پھر (انہیں چھوڑ کر ان کی لڑکیوں سے نکاح کر لینے میں) تم پر کوئی گناہ نہیں۔

﴿وَحَلَآئِلُ اَبۡنَآئِكُمُ الَّذِيۡنَ مِنۡ اَصۡلَابِكُمۡ﴾ ''اور تمہارے اُن بیٹوں کی بیویاں جو تمہاری صلب سے ہوں''

جن کو ہم بہوئیں کہتے ہیں۔ اپنے صلبی بیٹے کی بیوی سے نکاح حرام ہے۔ البتہ منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے نکاح میں کوئی حرج نہیں۔

﴿وَاَنۡ تَجۡمَعُوۡا بَيۡنَ الۡاُخۡتَيۡنِ﴾ ''اور یہ (بھی تم پر حرام کر دیا گیا ہے) کہ تم بیک وقت دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرو''

﴿اِلَّا مَا قَدۡ سَلَفَ ؕ﴾ ''سوائے اس کے کہ جو گزر چکا۔''

﴿اِنَّ اللّٰہَ کَانَ غَفُوۡرًا رَّحِیۡمًا ﴿۲۳﴾﴾ ''یقیناً اللہ غفور اور رحیم ہے۔''

جو پہلے ہو گیا سو ہو گیا۔ اب گڑے مردے تو اکھاڑے نہیں جا سکتے۔ لیکن آئندہ کے لیے یہ محرماتِ ابدیہ ہیں۔ اس میں رسول اللہ ﷺ نے اضافہ کیا ہے کہ جس طرح دو بہنوں کو بیک وقت نکاح میں نہیں رکھ سکتے اسی طرح خالہ بھانجی کو اور پھوپھی بھتیجی کو بھی بیک وقت نکاح میں نہیں رکھ سکتے۔ یہ محرماتِ ابدیہ ہیں کہ جن کے ساتھ کسی حال میں' کسی وقت شادی نہیں ہو سکتی۔ اب وہ محرمات بیان ہو رہی ہیں جو عارضی ہیں۔

آیت ۲۴ ﴿وَّ الۡمُحۡصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ﴾ ''اور وہ عورتیں (بھی تم پر حرام ہیں) جو کسی اور کے نکاح میں ہوں''

چونکہ وہ کسی اور کے نکاح میں ہیں اس لیے آپ پر حرام ہیں۔ ایک عورت کو اگر اس کا شوہر طلاق دے دے تو آپ اس سے نکاح کر سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ حرمت ابدی نوعیت کی نہیں ہے۔ ''مُحۡصَنٰت'' اُن عورتوں کو کہا جاتا ہے جو کسی کی قید نکاح میں ہوں۔ ''حِصن'' قلعے کو کہتے ہیں اور ''اِحصان'' کے معنی کسی شے کو اپنی حفاظت میں لینے کے بھی اور کسی کی حفاظت میں ہونے کے بھی۔ چنانچہ ''مُحۡصَنٰت'' وہ عورتیں ہیں جو ایک خاندان کے قلعے کے اندر محفوظ ہیں اور شوہر والیاں ہیں۔ نیز یہ لفظ لونڈیوں کے مقابل آزاد خاندانی شریف زادیوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

﴿اِلَّا مَا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ ۚ﴾ ''سوائے اس کے کہ جو تمہاری مِلکِ یمین بن جائیں۔''

یعنی جنگ کے نتیجے میں تمہارے ہاں کنیزیں بن کر آجائیں۔ یہ عورتیں اگرچہ مشرکوں کی بیویاں ہیں لیکن وہ لونڈیوں کی حیثیت سے آپ کے لیے جائز ہوں گی۔

﴿کِتٰبَ اللّٰہِ عَلَیۡکُمۡ ۚ﴾ ''یہ تم پر اللہ کا لکھا ہوا فریضہ ہے۔''

یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازم کر دی گئی ہے۔

﴿وَ اُحِلَّ لَکُمۡ مَّا وَرَآءَ ذٰلِکُمۡ﴾ ''ان کے سوا جو عورتیں ہیں وہ تمہارے لیے حلال ہیں''

آپ نے دیکھا کہ کتنی تھوڑی سی تعداد میں محرمات ہیں، جن سے نکاح حرام قرار دے دیا گیا ہے، باقی کثیر تعداد حلال ہے۔ یعنی مباحات کا دائرہ بہت وسیع ہے جبکہ محرمات کا دائرہ بہت محدود ہے۔

﴿اَنۡ تَبۡتَغُوۡا بِاَمۡوَالِکُمۡ﴾ ''کہ تم اپنے مال کے ذریعے ان کے طالب بنو'' یعنی ان کے مہر ادا کر کے ان کے ساتھ نکاح کرو۔

﴿مُّحۡصِنِیۡنَ غَیۡرَ مُسٰفِحِیۡنَ ؕ﴾ ''بشرطیکہ حصارِ نکاح میں ان کو محفوظ کرو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو۔''

یعنی نیت گھر بسانے کی ہو، صرف مستی نکالنے کی نہیں۔ اس کو محض ایک کھیل اور مشغلہ نہ بنا لو۔

﴿فَمَا اسۡتَمۡتَعۡتُمۡ بِهٖ مِنۡهُنَّ فَاٰتُوۡهُنَّ اُجُوۡرَهُنَّ فَرِیۡضَةً ؕ﴾ ''پس جو بھی تم نے ان سے تمتع کیا ہو تو اس کے بدلے ان کے مہر ادا کرو، جو مقرر ہوئے تھے۔''

﴿وَلَا جُنَاحَ عَلَیۡکُمۡ فِیۡمَا تَرٰضَیۡتُمۡ بِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِ الۡفَرِیۡضَةِ ؕ﴾ ''البتہ اس کا تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ مہر مقرر ہونے کے بعد باہمی رضامندی سے کوئی کمی بیشی کر لو۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ کَانَ عَلِیۡمًا حَکِیۡمًا ﴿۲۴﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ علیم اور حکیم ہے۔''

آیت ۲۵ ﴿وَمَنۡ لَّمۡ یَسۡتَطِعۡ مِنۡکُمۡ طَوۡلًا اَنۡ یَّنۡکِحَ الۡمُحۡصَنٰتِ الۡمُؤۡمِنٰتِ﴾ ''اور جو کوئی تم میں سے اتنی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں سے شادی کر سکے''

﴿فَمِنۡ مَّا مَلَکَتۡ اَیۡمَانُکُمۡ مِّنۡ فَتَیٰتِکُمُ الۡمُؤۡمِنٰتِ ؕ﴾ ''تو وہ تمہاری اُن لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کر لے جو تمہارے قبضہ میں ہوں اور مؤمنہ ہوں۔''

یہاں ''مُحۡصَنٰت'' دوسرے معنی میں آیا ہے، یعنی شریف زادیاں، آزاد مسلمان عورتیں۔ اور ظاہر ہے آزاد مسلمان عورتوں کا تو مہر ادا کرنا پڑے گا۔ اس حوالے سے اگر کوئی بے چارہ مفلس ہے، ایک خاندانی عورت کا مہر ادا نہیں کر سکتا تو وہ کیا کرے؟ ایسے لوگوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ وہ معاشرے میں موجود مسلمان لونڈیوں سے نکاح کر لیں۔

﴿وَاللّٰهُ اَعۡلَمُ بِاِیۡمَانِکُمۡ ؕ﴾ ''اللہ تمہارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے۔''

یہ اللہ بہتر جانتا ہے کہ کون مؤمن ہے اور کون نہیں ہے۔ مراد یہ ہے کہ جو بھی قانونی اعتبار سے مسلمان ہے دنیا میں وہ مؤمن سمجھا جائے گا۔

﴿بَعۡضُکُمۡ مِّنۡۢ بَعۡضٍ ۚ﴾ ''تم سب ایک دوسرے ہی میں سے ہو۔''

﴿فَانۡکِحُوۡہُنَّ بِاِذۡنِ اَہۡلِہِنَّ﴾ ''سو اُن سے نکاح کر لو ان کے مالکوں کی اجازت سے''

کسی لونڈی کا مالک اس سے جنسی تعلق قائم کرسکتا ہے۔لیکن جب ایک شخص اُس کی اجازت سے اس کی لونڈی سے نکاح کرلے تو اب لونڈی کے مالک کا یہ تعلق منقطع ہو جائے گا۔ اب وہ لونڈی اس اعتبار سے اس کے کام میں نہیں آسکتی' بلکہ اب وہ ایک مسلمان کی منکوحہ ہو جائے گی۔اسی لیے اُس نکاح کے لیے ''بِاِذۡنِ اَہۡلِہِنَّ'' کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔واضح رہے کہ اُس وقت کے معاشرے میں بالفعل یہ شکلیں موجود تھیں۔یہ نہیں کہا جارہا کہ یہ شکلیں پیدا کرو۔غلام اور لونڈیوں کا معاملہ اُس وقت کے بین الاقوامی حالات اور اسیرانِ جنگ کے مسئلے کے ایک حل کے طور پر پہلے سے موجود تھا۔ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جس معاشرے میں قرآن نے اصلاح کا عمل شروع کیا اس میں فی الواقع کیا صورت حال تھی اور اس میں کس کس اعتبار سے تدریجاً بہتری پیدا کی گئی۔

﴿وَاٰتُوۡہُنَّ اُجُوۡرَہُنَّ بِالۡمَعۡرُوۡفِ﴾ ''اور انہیں ان کے مہر ادا کرو معروف طریقے پر''

﴿مُحۡصَنٰتٍ غَیۡرَ مُسٰفِحٰتٍ﴾ ''ان کو حصارِ نکاح میں لا کر' نہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے والیاں ہوں''

ان سے نکاح کا تعلق ہوگا' جس میں نیت گھر میں بسانے کی ہونی چاہیے' محض مستی نکالنے کی اور شہوت رانی کی نیت نہ ہو۔یہ حصارِ نکاح میں محفوظ ہو کر رہیں' آزاد شہوت رانی نہ کرتی پھریں۔

﴿وَّلَا مُتَّخِذٰتِ اَخۡدَانٍ ۚ﴾ ''اور نہ ہی چوری چھپے آشنائیاں کریں۔''

کسی کی لونڈی سے کسی کا نکاح ہو تو کھلم کھلا ہو۔معلوم ہو کہ فلاں کی لونڈی اب فلاں کے نکاح میں ہے۔جیسے حضرت سمیہؓ سے حضرت یاسرؓ نے نکاح کیا تھا۔حضرت سمیہؓ ابوجہل کے چچا کی لونڈی تھیں' جو ایک شریف انسان تھا۔حضرت یاسرؓ جب یمن سے آ کر مکہ میں آباد ہوئے تو انہوں نے ابوجہل کے چچا سے اجازت لے کر ان کی لونڈی سمیہؓ سے شادی کر لی۔ان سے

حضرت عمارؓ پیدا ہوئے۔ یہ تین افراد کا ایک کنبہ تھا۔ یاسر‘ عمار بن یاسر اور عمار کی والدہ سمیہ رضی اللہ عنہم۔ ابوجہل کا شریف النفس چچا جب فوت ہو گیا تو ابوجہل کو اس کنبے پر اختیار حاصل ہو گیا اور اُس نے اس خاندان کو بدترین ایذائیں دی۔

﴿فَاِذَآ اُحۡصِنَّ فَاِنۡ اَتَیۡنَ بِفَاحِشَۃٍ﴾ ’’پس جب وہ قیدِ نکاح میں آ جائیں تو پھر اگر وہ بے حیائی کا کام کریں‘‘

﴿فَعَلَیۡہِنَّ نِصۡفُ مَا عَلَی الۡمُحۡصَنٰتِ مِنَ الۡعَذَابِ ؕ﴾ ’’تو اُن پر اُس سزا کی بہ نسبت آدھی سزا ہے جو آزاد عورتوں کے لیے ہے۔‘‘

لونڈیاں اگر قیدِ نکاح میں آنے کے بعد بدچلنی کی مرتکب ہوں تو بدکاری کی جو سزا آزاد عورتوں کو دی جائے گی انہیں اس کی نصف سزا دی جائے گی۔ واضح رہے کہ یہ ابتدائی احکامات ہیں۔ ابھی تک نہ تو سو کوڑوں کی سزا کا حکم آیا تھا اور نہ رجم کا۔ چنانچہ ’’اٰذُوۡھُمَا‘‘ کے حکم کی تعمیل میں بدکاری کی جو سزا بھی آزاد خاندانی عورتوں کو دی جاتی تھی ایک منکوحہ لونڈی کو اس سے نصف سزا دینے کا حکم دیا گیا۔ اس لیے کہ ایک شریف خاندان کی عورت جسے ہر طرح کا تحفظ حاصل ہو اس کا معاملہ اور ہے اور ایک بے چاری غریب لونڈی کا معاملہ اور ہے۔

﴿ذٰلِکَ لِمَنۡ خَشِیَ الۡعَنَتَ مِنۡکُمۡ﴾ ’’یہ اجازت تم میں سے ان کے لیے ہے جن کو گناہ میں پڑنے کا اندیشہ ہو۔‘‘

مسلمان لونڈیوں سے نکاح کر لینے کی اجازت تم میں سے ان لوگوں کے لیے ہے جو اپنی شہوت اور جنسی جذبے کو روک نہ سکتے ہوں اور انہیں فتنے میں مبتلا ہو جانے اور گناہ میں ملوث ہو جانے کا اندیشہ ہو۔

﴿وَاَنۡ تَصۡبِرُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ ؕ﴾ ’’اور اگر تم صبر کرو تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے۔‘‘

چونکہ عام طور پر اُس معاشرے میں جو باندیاں تھیں وہ بلند کردار نہیں تھیں‘ لہٰذا فرمایا کہ بہتر یہ ہے کہ تم ان سے نکاح کرنے سے بچو اور تعفف اختیار کرو۔

﴿وَاللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۲۵﴾﴾ ’’اور اللہ غفور اور رحیم ہے۔‘‘

آیات ۲۶ تا ۲۸

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٢٦﴾ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۣ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿٢٧﴾ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿٢٨﴾﴾

ان تین آیات میں احکامِ شریعت کے ضمن میں فلسفہ وحکمت کا بیان ہو رہا ہے۔ احکامِ شریعت کو انسان اپنے اوپر بوجھ سمجھنے لگتا ہے۔ اسے جب حکم دیا جاتا ہے کہ یہ کرو اور یہ مت کرو تو آدمی کی طبیعت ناگواری محسوس کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عیسائیوں نے شریعت کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکا ہے۔ ۱۹۷۰ء میں کرسمس کے موقع پر میں لندن میں تھا۔ وہاں میں نے ایک عیسائی دانشور کی تقریر سنی تھی، جس نے کہا تھا کہ شریعت لعنت ہے۔ خواہ مخواہ ایک انسان کو یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہ حلال ہے، یہ حرام ہے۔ جب وہ حرام سے رُک نہیں سکتا تو اس کا دل میلا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو خطا کار سمجھنے لگتا ہے اور مجرم ضمیر (guilty conscience) ہو جاتا ہے۔ اس احساس کے تحت وہ منفی نفسیات کا شکار ہو جاتا ہے۔ ان کے نزدیک اس ساری خرابی کا سبب یہ ہے کہ آپ نے حرام اور حلال کا فلسفہ چھیڑا۔ اگر سب کام حلال سمجھ لیے جائیں تو کوئی حرام کام کرتے ہوئے ضمیر پر کوئی بوجھ نہیں ہوگا۔ دنیا میں ایسے ایسے فلسفے بھی موجود ہیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ کے نزدیک فلسفۂ احکام یہ ہے:

آیت ۲۶ ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ﴾ ”اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے اپنے احکام واضح کر دے“

﴿وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ ”اور تمہیں ہدایت بخشے ان راستوں کی جو تم سے پہلے کے لوگوں کے تھے“

پہلے گزرے ہوئے لوگوں میں نیکوکار بھی تھے اور بدکار بھی۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تم انبیاء وصلحاء اور نیکوکاروں کا راستہ اختیار کرو ﴿صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ﴾ اور تم دوسرے راستوں سے بچ سکو۔

﴿وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ﴾ ''اور تم پر نظرِ عنایت فرمائے۔''

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ﴾ ''اور اللہ سب کچھ جاننے والا کمالِ حکمت والا ہے۔''

آیت ۲۷ ﴿وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ قف﴾ ''اللہ تو یہ چاہتا ہے کہ تم پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائے۔''

﴿وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ﴿۲۷﴾﴾ ''اور وہ لوگ جو شہوات کی پیروی کرتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہِ حق سے بھٹک کر دور نکل جاؤ۔''

وہ چاہتے ہیں کہ تمہارا رجحان صراطِ مستقیم کے بجائے غلط راستوں کی طرف ہو جائے اور اُدھر ہی تم بھٹکتے چلے جاؤ۔ آج بھی عورت کی آزادی (Women Lib) کی بنیاد پر اور حقوقِ نسواں کے نام پر دنیا میں جو تحریکیں برپا ہیں یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ حدود و قیود کو توڑ کر جنسی بے راہروی پھیلانے کی ایک عظیم سازش ہے جو دنیا میں چل رہی ہے۔

آیت ۲۸ ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ج﴾ ''اللہ چاہتا ہے کہ تم پر سے بوجھ کو ہلکا کرے۔''

تم یہ نہ سمجھو کہ اللہ تم پر بوجھ ڈال رہا ہے۔ اللہ تو تم پر تخفیف چاہتا ہے' تم سے بوجھ کو ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ اگر تم ان چیزوں پر عمل نہیں کرو گے تو معاشرے میں گندگیاں پھیلیں گی' فساد برپا ہوگا' جھگڑے ہوں گے' بدگمانیاں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ اس سب کی روک تھام چاہتا ہے' وہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے۔

﴿وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾﴾ ''اور انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔''

اس کے اندر کمزوری کے پہلو بھی موجود ہیں۔ جہاں ایک بہت اونچا پہلو ہے کہ اس میں روحِ ربانی پھونکی گئی ہے' وہاں اس کے اندر نفس بھی تو ہے' جس میں ضعف کے پہلو موجود ہیں۔

آیات ۲۹ تا ۳۵

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ قف وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ﴿۲۹﴾ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾ اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبٰٓئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ

نُکَفِّرْ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَنُدْخِلْکُمْ مُّدْخَلاً کَرِیْمًا ۳۱ وَلاَ تَتَمَنَّوْا مَا
فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعْضَکُمْ عَلٰی بَعْضٍ ط لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا ط
وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ ط وَسْئَلُوا اللّٰہَ مِنْ فَضْلِہٖ ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ
بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ۳۲ وَلِکُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَکَ الْوَالِدٰنِ
وَالْاَقْرَبُوْنَ ط وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُکُمْ فَاٰتُوْھُمْ نَصِیْبَھُمْ ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ
عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَھِیْدًا ۳۳ اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ
اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ ط فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ
حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ ط وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَھُنَّ فَعِظُوْھُنَّ
وَاھْجُرُوْھُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْھُنَّ ج فَاِنْ اَطَعْنَکُمْ فَلاَ تَبْغُوْا
عَلَیْھِنَّ سَبِیْلاً ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیًّا کَبِیْرًا ۳۴ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَیْنِھِمَا
فَابْعَثُوْا حَکَمًا مِّنْ اَھْلِہٖ وَحَکَمًا مِّنْ اَھْلِھَا ج اِنْ یُّرِیْدَآ اِصْلاَحًا یُّوَفِّقِ
اللّٰہُ بَیْنَھُمَا ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلِیْمًا خَبِیْرًا ۳۵﴾

آیت ۲۹ ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لاَ تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ﴾ ”اے اہل ایمان، اپنے مال آپس میں باطل طریقے پر ہڑپ نہ کرو“

﴿اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ قف﴾ ”سوائے اس کے کہ تجارت ہو تمہاری باہمی رضامندی سے۔“

تجارت اور لین دین کی بنیاد جب حقیقی باہمی رضامندی پر ہو تو اس سے حاصل ہونے والا منافع جائز اور حلال ہے۔ فرض کیجیے کہ آپ کی جوتوں کی دکان ہے۔ آپ نے گاہک کو ایک جوتا دکھایا اور اس کے دام دو سو روپے بتائے۔ اُس نے جوتا پسند کیا اور دو سو روپے میں خرید لیا۔ یہ باہمی رضامندی سے سودا ہے جو سیدھے سادھے اور صحیح طریقے پر ہو گیا۔ ظاہر بات ہے کہ اس میں سے کچھ نہ کچھ نفع تو آپ نے کمایا ہے۔ آپ نے اس کے لیے محنت کی ہے، کہیں سے خرید کر لائے ہیں، اسے سٹور میں محفوظ کیا ہے، دکان کا کرایہ دیا ہے، لہٰذا یہ منافع آپ کا حق ہے اور گاہک کو اس میں تأمل نہیں ہوگا۔ لیکن اگر آپ نے یہی جوتا جھوٹ بول کر یا جھوٹی قسم کھا کر فروخت کیا کہ میں نے تو خود اتنے کا لیا ہے تو اس طرح آپ نے اپنی ساری

محنت بھی ضائع کی اور آپ نے حرام کما لیا۔ اسی طرح معاملت اور لین دین کے وہ تمام طریقے جن کی بنیاد جھوٹ اور دھوکہ دہی پر ہو ناجائز اور حرام ہیں۔

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ﴾ ''اور نہ اپنے آپ کو قتل کرو۔''

یعنی ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ تمدن کی بنیاد دو چیزوں پر ہے' احترامِ جان اور احترامِ مال۔ میرے لیے آپ کا مال اور آپ کی جان محترم ہے' میں اسے کوئی گزند نہ پہنچاؤں' اور آپ کے لیے میرا مال اور میری جان محترم ہے' اسے آپ گزند نہ پہنچائیں۔ اگر ہمارے مابین یہ شریفانہ معاہدہ (Gentleman's agreement) قائم رہے تب تو ہم ایک معاشرے اور ایک ملک میں رہ سکتے ہیں' جہاں اطمینان' امن وسکون اور چین ہوگا۔ اور جہاں یہ دونوں احترام ختم ہو گئے' جان کا اور مال کا' تو ظاہر بات ہے کہ پھر وہاں امن وسکون' چین اور اطمینان کہاں سے آئے گا؟ اس آیت میں باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانے اور قتل نفس دونوں کو حرام قرار دے کر ان دونوں حرمتوں کو ایک ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝۲۹﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر بہت مہربان ہے۔''

آیت ۳۰ ﴿وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا﴾ ''اور جو کوئی بھی یہ کام کرے گا تعدی اور ظلم کے ساتھ''

یعنی یہ دونوں کام —— باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانا اور قتل نفس۔

﴿فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ؕ﴾ ''تو ہم جلد اس کو جھونک دیں گے آگ میں۔''

﴿وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝۳۰﴾ ''اور یہ چیز اللہ پر بہت آسان ہے۔''

یہ مت سمجھنا کہ اللہ تعالیٰ نوعِ انسانی کے بہت بڑے حصے کو جہنم میں کیسے جھونک دے گا؟ یہ اللہ کے لیے کوئی مشکل نہیں ہے۔

اگلی دو آیات میں انسانی تمدن کے دو بہت اہم مسائل بیان ہو رہے ہیں' جو بڑے گہرے اور فلسفیانہ اہمیت کے حامل ہیں۔ پہلا مسئلہ گناہوں کے بارے میں ہے' جن میں کبائر اور صغائر کی تقسیم ہے۔ بڑے گناہوں میں سب سے بڑا گناہ شرک اور پھر کفر ہے۔ پھر یہ کہ جو فرائض ہیں ان کا ترک کرنا اور جو حرام چیزیں ہیں ان کا ارتکاب کبائر میں شامل ہوگا۔ ایک ہیں چھوٹی چھوٹی کوتاہیاں جو انسان سے اکثر ہو جاتی ہیں' مثلاً آداب میں یا احکام کی جزئیات

میں کوئی کوتاہی ہوگئی‘ یا بغیر کسی ارادے کے کہیں کسی کو ایسی بات کہہ بیٹھے کہ جو غیبت کے حکم میں آ گئی‘ وغیرہ وغیرہ۔ اس ضمن میں صحت مندانہ رویہ یہ ہے کہ کبائر سے پورے اہتمام کے ساتھ بچا جائے کہ اس سے انسان بالکل پاک ہو جائے۔ فرائض کی پوری ادائیگی ہو‘ محرمات سے مطلق اجتناب ہو‘ اور یہ جو چھوٹی چھوٹی چیزیں ہیں ان کے بارے میں نہ تو ایک دوسرے پر زیادہ گرفت اور نکیر کی جائے اور نہ ہی خود زیادہ دل گرفتہ ہوا جائے‘ بلکہ ان کے بارے میں توقع رکھی جائے کہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دے گا۔ ان کے بارے میں استغفار بھی کیا جائے اور یہی صغائر ہیں جو نیکیوں کے ذریعے سے خود بخود بھی ختم ہوتے رہتے ہیں۔ جیسے حدیث میں آتا ہے کہ اَعضائے وضو دھوتے ہوئے ان اعضاء کے گناہ دُھل جاتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص وضو کرتا ہے تو جب وہ کلی کرتا ہے اور ناک میں پانی ڈالتا ہے تو اُس کے منہ اور ناک سے اس کے گناہ نکل جاتے ہیں۔ جب وہ چہرہ دھوتا ہے تو اس کے چہرے اور اس کی آنکھوں سے اُس کے گناہ نکل جاتے ہیں۔ جب وہ ہاتھ دھوتا ہے تو اس کے ہاتھوں سے گناہ نکل جاتے ہیں‘ یہاں تک کہ اس کے ہاتھوں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ دھل جاتے ہیں۔ جب وہ سر کا مسح کرتا ہے تو اُس کے سر اور کانوں سے گناہ جھڑ جاتے ہیں۔ پھر جب وہ پاؤں دھوتا ہے تو اس کے پاؤں سے گناہ نکل جاتے ہیں‘ یہاں تک کہ اس کے پاؤں کے ناخنوں کے نیچے سے بھی گناہ نکل جاتے ہیں۔ پھر اس کا مسجد کی طرف چلنا اور نماز پڑھنا اس کی نیکیوں میں اضافہ بنتا ہے۔(۱)

یہ صغیرہ گناہ ہیں جو نیکیوں کے اثر سے معاف ہوتے رہتے ہیں‘ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ الۡحَسَنٰتِ یُذۡهِبۡنَ السَّیِّاٰتِ﴾ (هود:١١٤) ''یقیناً نیکیاں برائیوں کو دُور کر دیتی ہیں''۔ ان برائیوں سے مراد کبائر نہیں‘ صغائر ہیں۔ کبائر توبہ کے بغیر معاف نہیں ہوتے (اِلّا ماشاءاللہ!) ان کے لیے توبہ کرنی ہوگی۔ اور جو اکبرالکبائر یعنی شرک ہے اس کے بارے میں تو اس سورت میں دو مرتبہ یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغۡفِرُ اَنۡ یُّشۡرَکَ بِهٖ وَیَغۡفِرُ مَا دُوۡنَ ذٰلِکَ لِمَنۡ یَّشَآءُ﴾ (آیت ۴۸ و ۱۱۶) ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ یہ بات تو کبھی معاف نہیں کرے گا کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے‘ اور اس کے ماسوا جس قدر گناہ ہیں وہ جس

(۱) سنن النسائی‘ کتاب الطهارة‘ باب مسح الاذنین مع الرأس ...... وسنن ابن ماجه‘ کتاب الطهارة وسننها‘ باب ثواب الطهور۔ ومسند احمد۔ عن عبد اللّٰه الصنابحی رضی اللہ عنہ۔

کے لیے چاہے گا معاف کر دے گا''۔لیکن ہمارے ہاں مذہب کا جو مسخ شدہ (perverted) تصور موجود ہے اس سے ایک ایسا مذہبی مزاج وجود میں آتا ہے کہ جو کبائر ہیں وہ تو ہو رہے ہیں‘ سود خوری ہو رہی ہے‘ حرام خوری ہو رہی ہے‘ مگر چھوٹی چھوٹی باتوں پر نکیر ہو رہی ہے۔ساری گرفت ان باتوں پر ہو رہی ہے کہ تمہاری داڑھی کیوں شرعی نہیں ہے‘ اور تمہارا پائنچہ ٹخنوں سے نیچے کیوں ہے؟ قرآن مجید میں اس معاملے کو تین جگہ نقل کیا گیا ہے کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے بارے میں درگزر سے بھی کام لو اور یہ کہ بہت زیادہ متفکر بھی نہ ہو۔اس معاملے میں باہمی نسبت و تناسب پیش نظر رہنی چاہیے۔فرمایا:

آیت ۳۱ ﴿اِنۡ تَجۡتَنِبُوۡا کَبَآئِرَ مَا تُنۡهَوۡنَ عَنۡهُ﴾ ''اگر تم اجتناب کرتے رہو گے اُن بڑے بڑے گناہوں سے جن سے تمہیں روکا جا رہا ہے''

﴿نُکَفِّرۡ عَنۡکُمۡ سَیِّاٰتِکُمۡ﴾ ''تو ہم تمہاری چھوٹی برائیوں کو تم سے دور کر دیں گے''

ہم تمہیں ان سے پاک صاف کرتے رہیں گے۔تم جو بھی نیک کام کرو گے ان کے حوالے سے تمہاری سیّئات خود بخود دھلتی رہیں گی۔

﴿وَنُدۡخِلۡکُمۡ مُّدۡخَلًا کَرِیۡمًا ﴿۳۱﴾﴾ ''اور تمہیں داخل کریں گے بہت باعزت جگہ پر۔''

یہ مضمون سورۃ الشوریٰ میں بھی آیا ہے اور پھر سورۃ النجم میں بھی۔واضح رہے کہ قرآن حکیم میں اہم مضامین کم از کم دو مرتبہ ضرور آتے ہیں اور یہ مضمون قرآن میں تین بار آیا ہے۔

دوسرا مسئلہ انسانی معاشرے میں فضیلت کا ہے۔ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو ایک جیسا تو نہیں بنایا ہے۔کسی کو خوبصورت بنا دیا تو کسی کو بدصورت۔کوئی صحیح سالم ہے تو کوئی ناقص الاعضاء ہے۔کسی کا قد اونچا ہے تو کوئی ٹھگنے قد کا ہے اور لوگ اس پر ہنستے ہیں۔کسی کو مرد بنا دیا‘ کسی کو عورت۔اب کوئی عورت اندر ہی اندر کڑھتی رہے کہ مجھے اللہ نے عورت کیوں بنایا تو اس کا حاصل کیا ہو گا؟ اسی طرح کوئی بدصورت انسان ہے یا ٹھگنا ہے یا کسی اور اعتبار سے کمتر ہے اور وہ دوسرے شخص کو دیکھتا ہے کہ وہ تو بڑا اچھا ہے‘ تو اب اس پر کڑھنے کے بجائے یہ ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے جو کچھ دیا ہے اس پر صبر اور شکر کرے۔اللہ کا فضل کسی اور پہلو سے بھی ہو سکتا ہے۔لہٰذا وہ ارادہ کرے کہ میں نیکی اور خیر کے کاموں میں آگے بڑھ جاؤں‘ میں علم میں آگے بڑھ جاؤں۔اس طرح انسان دوسری چیزوں سے ان چیزوں کی تلافی کر لے جو

اسے میسر نہیں ہیں' بجائے اس کے کہ ایک منفی نفسیات پروان چڑھتی چلی جائے۔ اس طرح انسان احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا ہے اور اندر ہی اندر کڑھتے رہنے سے طرح طرح کی ذہنی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں۔ ذہنی الجھنوں' محرومیوں اور ناکامیوں کے احساسات کے تحت انسان اپنا ذہنی توازن تک کھو بیٹھتا ہے۔ چنانچہ دیکھئے اس ضمن میں کس قدر عمدہ تعلیم دی جا رہی ہے:

آیت ۳۲ ﴿وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ؕ﴾ ''اور تمنا نہ کیا کرو اُس شے کی جس کے ذریعے سے اللہ نے تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دے دی ہے۔''

اللہ تعالیٰ نے بعض لوگوں کو ان کی خلقی صفات کے اعتبار سے دوسروں پر فضیلت دی ہے۔ آدمی کی یہ ذہنیت کہ جہاں کسی دوسرے کو اپنے مقابلہ میں کسی حیثیت سے بڑھا ہوا دیکھے بے چین ہو جائے' اس کے اندر حسد' رقابت اور عداوت کے جذبات پیدا کر دیتی ہے۔ اس آیت میں اسی ذہنیت سے بچنے کی ہدایت فرمائی جا رہی ہے۔ فضیلت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو مرد بنایا' کسی کو عورت۔ یہ چیز بھی خلقی ہے اور کسی عورت کی مرد بننے یا کسی مرد کی عورت بننے کی تمنا نری حماقت ہے۔ البتہ دنیا میں قسمت آزمائی اور جدوجہد کے مواقع سب کے لیے موجود ہیں۔ چنانچہ پہلی بات یہ بتائی جا رہی ہے:

﴿لِلرِّجَالِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ؕ﴾ ''مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں گے۔''

﴿وَلِلنِّسَآءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ؕ﴾ ''اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو وہ کمائیں گی۔''

یعنی جہاں تک نیکیوں' خیرات اور حسنات کا معاملہ ہے' یا سیئات و منکرات کا معاملہ ہے' مرد و زن میں بالکل مساوات ہے۔ مرد نے جو نیکی کمائی وہ اس کے لیے ہے اور عورت نے جو نیکی کمائی وہ اس کے لیے ہے۔ مسابقت کا یہ میدان دونوں کے لیے کھلا ہے۔ عورت نیکی میں مرد سے آگے نکل سکتی ہے۔ کروڑوں مرد ہوں گے جو قیامت کے دن حضرت خدیجہ' حضرت عائشہ اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہن کے مقام پر رشک کریں گے اور ان کی خاک کو بھی نہیں پہنچ سکیں گے۔ چنانچہ آدمی کا طرزِ عمل تسلیم و رضا کا ہونا چاہیے کہ جو بھی اللہ نے مجھے بنا دیا اور جو کچھ مجھے عطا فرمایا اس حوالے سے مجھے بہتر سے بہتر کرنا ہے۔ میرا ''شاکلہ'' تو اللہ کی طرف سے آ گیا ہے' جس سے میں تجاوز نہیں کر سکتا: ﴿قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ ؕ﴾ (بنی اسراء یل:۸۴)

اور ہم سورۃ البقرۃ میں پڑھ چکے ہیں کہ ﴿لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفۡسًا اِلَّا وُسۡعَہَا ؕ﴾ (آیت ۲۸۶) لہٰذا میری ''وسعت'' جو ہے وہ اللہ نے بنا دی ہے۔

سورۃ النساء کی زیر مطالعہ آیت سے بعض لوگ یہ مطلب نکالنے کی کوشش کرتے ہیں کہ عورتیں بھی مال کما سکتی ہیں۔ یہ بات سمجھ لیجیے کہ قرآن مجید میں صرف ایک مقام (البقرۃ:۲۶۷) پر ''کسب'' کا لفظ معاشی جدوجہد اور معاشی کمائی کے لیے آیا ہے: ﴿اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبۡتُمۡ﴾۔ باقی پورے قرآن میں ''کسب'' جہاں بھی آیا ہے اعمال کے لیے آیا ہے۔ کسبِ حسنات نیکیاں کمانا ہے اور کسبِ سیئات بدیاں کمانا۔ آپ اس آیت کے الفاظ پر دوبارہ غور کیجیے: ﴿لِلرِّجَالِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا اکۡتَسَبُوۡا ؕ وَ لِلنِّسَآءِ نَصِیۡبٌ مِّمَّا اکۡتَسَبۡنَ ؕ﴾ ''مردوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو انہوں نے کمایا' اور عورتوں کے لیے حصہ ہے اس میں سے جو انہوں نے کمایا''۔ تو کیا ایک عورت کی تنخواہ اگر دس ہزار ہے تو اسے اس میں سے پانچ ہزار ملیں گے؟ نہیں' بلکہ اسے پوری تنخواہ ملے گی۔ لہٰذا اس آیت میں ''کسب'' کا اطلاق دُنیوی کمائی پر نہیں کیا جا سکتا۔ ایک خاتون کوئی کام کرتی ہے یا کہیں ملازمت کرتی ہے تو اگر اس میں کوئی حرام پہلو نہیں ہے' شریفانہ جاب ہے' اور وہ ستر وحجاب کے آداب بھی ملحوظ رکھتی ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ جو بھی کمائی ہوگی وہ پوری اس کی ہوگی' اس میں اس کا حصہ تو نہیں ہوگا۔ البتہ یہ اسلوب جزائے اعمال کے لیے آتا ہے کہ انہیں ان کی کمائی میں سے حصہ ملے گا۔ اس لیے کہ اعمال کے مختلف مراتب ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ دیکھا جاتا ہے کہ اس عمل میں خلوصِ نیت کتنا تھا اور آداب کتنے ملحوظ رکھے گئے۔ ہم سورۃ البقرۃ میں حج کے ذکر میں بھی پڑھ چکے ہیں کہ ﴿اُولٰٓئِکَ لَہُمۡ نَصِیۡبٌ مِّمَّا کَسَبُوۡا ؕ﴾ (آیت ۲۰۲) یعنی جو انہوں نے کمایا ہوگا اس میں سے انہیں حصہ ملے گا۔ اسی طرح یہاں پر بھی اکتساب سے مراد اچھے یا برے اعمال کمانا ہے۔ یعنی اخلاقی سطح پر اور انسانی عزت وتکریم کے لحاظ سے عورت اور مرد برابر ہیں' لیکن معاشرتی ذمہ داریوں کے حوالے سے اللہ تعالیٰ نے جو تقسیم کار رکھی ہے اس کے اعتبار سے فرق ہے۔ اب اگر عورت اس فرق کو قبول کرنے پر تیار نہ ہو' مفاہمت پر رضامند نہ ہو' اور وہ اس پر کڑھتی رہے اور مرد کے بالکل برابر ہونے کی کوشش کرے تو ظاہر ہے کہ معاشرے میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔

﴿وَ سۡـَٔلُوا اللّٰہَ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ﴾ ''اور اللہ سے اس کا فضل طلب کرو۔''

یعنی جو فضیلت اللہ نے دوسروں کو دے رکھی ہے اس کی تمنا نہ کرو' البتہ اُس سے فضل کی دعا کرو کہ اے اللہ! تو نے اس معاملے میں مجھے کمتر رکھا ہے' تو مجھے دوسرے معاملات کے اندر ہمت دے کہ میں ترقی کروں۔ اللہ تعالیٰ جس پہلو سے مناسب سمجھے گا اپنا فضل تمہیں عطا فرما دے گا۔ وہ بہت سے لوگوں کو کسی اور پہلو سے نمایاں کر دیتا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا﴿۳۲﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔''

آیت ۳۳ ﴿وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مَوَالِیَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ﴾ ''اور ہر ایک کے لیے ہم نے وارث مقرر کر دیے ہیں جو بھی والدین اور رشتہ دار چھوڑیں۔''

قانونِ وراثت کی اہمیت کو دیکھئے کہ اب آخر میں ایک مرتبہ پھر اس کا ذکر فرمایا۔

﴿وَالَّذِیْنَ عَقَدَتْ اَیْمَانُكُمْ فَاٰتُوْهُمْ نَصِیْبَهُمْ﴾ ''اور جن کے ساتھ تمہارے عہد و پیمان ہوں تو ان کو ان کا حصہ دو۔''

ایک نیا مسئلہ یہ پیدا ہو گیا تھا کہ جن لوگوں کے ساتھ دوستی اور بھائی چارہ ہے یا مواخات کا رشتہ ہے (مدینہ منورہ میں رسول اللہ ﷺ نے ایک انصاری اور ایک مہاجر کو بھائی بھائی بنا دیا تھا) تو کیا ان کا وراثت میں بھی حصہ ہے؟ اس آیت میں فرمایا گیا کہ وراثت تو اُسی قاعدہ کے مطابق ورثاء میں تقسیم ہونی چاہیے جو ہم نے مقرر کر دیا ہے۔ جن لوگوں کے ساتھ تمہارے دوستی اور بھائی چارے کے عہد و پیمان ہیں' یا جو منہ بولے بھائی یا بیٹے ہیں ان کا وراثت میں کوئی حصہ نہیں ہے' البتہ اپنی زندگی میں ان کے ساتھ جو بھلائی کرنا چاہو کر سکتے ہو' انہیں جو کچھ دینا چاہو دے سکتے ہو' اپنی وراثت میں سے بھی کچھ وصیت کرنا چاہو تو کر سکتے ہو۔ لیکن جو قانونِ وراثت طے ہو گیا ہے اُس میں کسی ترمیم و تبدیلی کی گنجائش نہیں۔ وراثت میں حق دار کوئی اور نہیں ہو گا سوائے اُس کے جس کو اللہ نے مقرر کر دیا ہے۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدًا﴿۳۳﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے۔''

اب آ رہی ہے اصل میں وہ کانٹے دار آیت جو عورتوں کے حلق سے بہت مشکل سے اُترتی ہے' کانٹا بن کر اٹک جاتی ہے۔ اب تک اس ضمن میں جو باتیں آئیں وہ دراصل اس کی تمہید کی حیثیت رکھتی ہیں۔ پہلی تمہید سورۃ البقرۃ میں آ چکی ہے: ﴿وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِیْ عَلَیْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ وَلِلرِّجَالِ عَلَیْهِنَّ دَرَجَةٌ﴾ (آیت ۲۲۸) ''اور عورتوں کے لیے اسی طرح حقوق ہیں جس طرح ان پر ذمہ داریاں ہیں دستور کے مطابق' البتہ مردوں کے لیے اُن پر ایک

درجہ فوقیت کا ہے''۔ یہ کہہ کر بات چھوڑ دی گئی۔ اس کے بعد ابھی ہم نے پڑھا: ﴿وَلَا تَتَمَنَّوۡا مَا فَضَّلَ اللّٰہُ بِہٖ بَعۡضَکُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ ؕ﴾ یہ ہدایت عورتوں کے لیے مزید ذہنی تیاری کی غرض سے دی گئی۔ اور اب دوٹوک انداز میں ارشاد ہو رہا ہے:

آیت ۳۴ ﴿اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوۡنَ عَلَی النِّسَآءِ﴾ ''مرد عورتوں پر حاکم ہیں''

یہ ترجمہ میں زور دے کر کر رہا ہوں۔ اس لیے کہ یہاں قَامَ 'عَلٰی' کے صلہ کے ساتھ آ رہا ہے۔ قَامَ 'بِ' کے ساتھ آئے گا تو معنی ہوں گے ''کسی شے کو قائم کرنا''۔ اسی سورۂ مبارکہ میں آگے چل کر یہ الفاظ آئیں گے: ﴿کُوۡنُوۡا قَوّٰمِیۡنَ بِالۡقِسۡطِ﴾ ''عدل کو قائم کرنے والے بن کر کھڑے ہو جاؤ!'' جبکہ قَامَ عَلٰی کا مفہوم ہے کسی کے اوپر مسلط ہونا' یعنی حاکم اور منتظم ہونا۔ چنانچہ آیت زیر مطالعہ سے یہ واضح ہدایت ملتی ہے کہ گھر کے ادارے میں حاکم ہونے کی حیثیت مرد کو حاصل ہے' سربراہِ خاندان مرد ہے' عورت نہیں ہے۔ عورت کو بہرحال اس کے ساتھ ایک وزیر کی حیثیت سے کام کرنا ہے۔ یوں تو ہر انسان یہ چاہتا ہے کہ میری بات مانی جائے۔ گھر کے اندر مرد بھی یہ چاہتا ہے اور عورت بھی۔ لیکن آخر کار کس کی بات چلے گی؟ یا تو دونوں باہمی رضامندی سے کسی مسئلے میں متفق ہو جائیں' بیوی اپنے شوہر کو دلیل سے' اپیل سے' جس طرح ہو سکے قائل کر لے تو معاملہ ٹھیک ہو گیا۔ لیکن اگر معاملہ طے نہیں ہو رہا تو اب کس کی رائے فیصلہ کن ہو گی؟ مرد کی! عورت کی رائے جب مسترد ہو گی تو اُسے اس سے ایک صدمہ تو پہنچے گا۔ اسی صدمے کا اثر کم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے عورت میں نسیان کا مادہ زیادہ رکھ دیا ہے' جو ایک safety valve کا کام دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانونِ شہادت میں ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کا نصاب رکھا گیا ہے ''تاکہ ان میں سے کوئی ایک بھول جائے تو دوسری یاد کرا دے''۔ اس پر ہم سورۃ البقرۃ (آیت ۲۸۲) میں بھی گفتگو کر چکے ہیں۔ بہرحال اللہ تعالیٰ نے گھر کے ادارے کا سربراہ مرد کو بنایا ہے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ مرد اگر اپنی اس حیثیت کا غلط استعمال کرتا ہے' عورت پر ظلم کرتا ہے اور اس کے حقوق ادا نہیں کرتا تو اللہ کے ہاں بڑی سخت پکڑ ہو گی۔ آپ کو ایک اختیار دیا گیا ہے اور آپ اس کا غلط استعمال کر رہے ہیں' اس کو ظلم کا ذریعہ بنا رہے ہیں تو اس کی سزا اللہ تعالیٰ کے ہاں آپ کو مل جائے گی۔

﴿بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعۡضَہُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ﴾ ''بسبب اُس فضیلت کے جو اللہ نے بعض کو بعض پر دی ہے''

مرد کو بعض صفات میں عورت پر نمایاں تفوّق حاصل ہے' جن کی بنا پر قوّامیت کی ذمہ داری اس پر ڈالی گئی ہے۔

﴿وَّبِمَآ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ ؕ﴾ ''اور بسبب اس کے کہ جو وہ خرچ کرتے ہیں اپنے مال۔''

اسلام کے معاشرتی نظام میں کفالتی ذمہ داری تمام تر مرد کے اوپر ہے۔ شادی کے آغاز ہی سے مرد اپنا مال خرچ کرتا ہے۔ شادی اگرچہ مرد کی بھی ضرورت ہے اور عورت کی بھی' لیکن مرد مہر دیتا ہے' عورت مہر وصول کرتی ہے۔ پھر گھر میں عورت کا نان نفقہ مرد کے ذمے ہے۔

﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ﴾ ''پس جو نیک بیویاں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں''

مرد کو قوامیت کے منصب پر فائز کرنے کے بعد اب نیک بیویوں کا رویہ بتایا جا رہا ہے۔ یوں سمجھئے کہ قرآن کے نزدیک ایک خاتونِ خانہ کی جو بہترین روش ہونی چاہیے وہ یہاں تین الفاظ میں بیان کر دی گئی ہے: ﴿فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَيۡبِ﴾۔

﴿حٰفِظٰتٌ لِّلۡغَيۡبِ﴾ ''غیب میں حفاظت کرنے والیاں''

وہ مردوں کی غیر موجودگی میں ان کے اموال اور حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔ ظاہر ہے مرد کا مال تو گھر میں ہی ہوتا ہے' وہ کام پر چلا گیا تو اب وہ بیوی کی حفاظت میں ہے۔ اسی طرح بیوی کی عصمت درحقیقت مرد کی عزت ہے۔ وہ اس کی غیر موجودگی میں اس کی عزت کی حفاظت کرتی ہے۔ اسی طرح مرد کے راز ہوتے ہیں' جن کی سب سے زیادہ بڑھ کر رازدان بیوی ہوتی ہے۔ تو یہ حفاظت تین اعتبارات سے ہے' شوہر کے مال کی' شوہر کی عزت و ناموس کی' اور شوہر کے رازوں کی۔

﴿بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ﴾ ''اللہ کی حفاظت سے۔''

اصل حفاظت و نگرانی تو اللہ کی ہے' لیکن انسان کو اپنی ذمہ داری ادا کرنی پڑتی ہے۔ جیسے رازق تو اللہ ہے' لیکن انسان کو کام کر کے رزق کمانا پڑتا ہے۔

﴿وَالّٰتِیۡ تَخَافُوۡنَ نُشُوۡزَهُنَّ﴾ ''اور وہ خواتین جن کے بارے میں تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو''

اگر کسی عورت کے رویے سے ظاہر ہو رہا ہو کہ یہ سرکشی' سرتابی' ضد اور ہٹ دھرمی کی روش پر چل پڑی ہے' شوہر کی بات نہیں مان رہی بلکہ ہر صورت میں اپنی بات منوانے پر مصر ہے اور

اس طرح گھر کی فضا خراب کی ہوئی ہے تو یہ نشوز ہے۔ اگر عورت اپنی اس حیثیت کو ذہناً تسلیم نہ کرے کہ وہ شوہر کے تابع ہے تو ظاہر بات ہے کہ مزاحمت (friction) ہوگی اور اس کے نتیجے میں گھر کے اندر ایک فساد پیدا ہوگا۔ ایسی صورت حال میں مرد کو قوّام ہونے کی حیثیت سے بعض تادیبی اختیارات دیے گئے ہیں، جن کے تین مراحل ہیں:

﴿فَعِظُوْهُنَّ﴾ ''پس ان کو نصیحت کرو''

پہلا مرحلہ سمجھانے بجھانے کا ہے، جس میں ڈانٹ ڈپٹ بھی شامل ہے۔

﴿وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ﴾ ''اور ان کو ان کے بستروں میں تنہا چھوڑ دو''

اگر نصیحت و ملامت سے کام نہ چلے تو دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ ان سے اپنے بستر علیحدہ کر لو اور اس کے ساتھ تعلق زن و شو کچھ عرصہ کے لیے منقطع کر لو۔

﴿وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ﴾ ''اور ان کو مارو۔''

اگر اب بھی وہ اپنی روش نہ بدلیں تو مرد کو جسمانی سزا دینے کا بھی اختیار ہے۔ اس ضمن میں آنحضور ﷺ نے ہدایت فرمائی ہے کہ چہرے پر نہ مارا جائے اور کوئی ایسی مار نہ ہو جس کا مستقل نشان جسم پر پڑے۔ مذکورہ بالا تادیبی ہدایات اللہ کے کلام کے اندر بیان فرمائی گئی ہیں اور انہیں بیان کرنے میں ہمارے لیے کوئی جھجک نہیں ہونی چاہیے۔ معاشرتی زندگی کو درست رکھنے کے لیے ان کی ضرورت پیش آئے تو انہیں اختیار کرنا ہوگا۔

﴿فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ﴾ ''پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کریں تو ان کے خلاف (خواہ مخواہ زیادتی کی) راہ مت تلاش کرو۔''

اگر عورت سرکشی و سرتابی کی روش چھوڑ کر اطاعت کی راہ پر آ جائے تو پچھلی کدورتیں بھلا دینی چاہئیں۔ اس سے انتقام لینے کے بہانے تلاش نہیں کرنے چاہئیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيًّا كَبِيْرًا ۝۳۴﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بلند ہے، بہت بڑا ہے۔''

آیت ۳۵ ﴿وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا﴾ ''اور اگر تم کو میاں بیوی کے درمیان افتراق کا اندیشہ ہو''

''اب اگر کوئی تدبیر نتیجہ خیز نہ ہو اور ان دونوں کے مابین ضدم ضدا کی کیفیت پیدا ہو چکی ہو کہ عورت بھی اکڑ گئی ہے، مرد بھی اکڑا ہوا ہے، اور اب ان کا ساتھ چلنا مشکل نظر آتا ہو تو

اصلاحِ احوال کے لیے ایک دوسری تدبیر اختیار کرنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

﴿فَابۡعَثُوۡا حَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهٖ وَحَكَمًا مِّنۡ اَهۡلِهَا‌ۚ﴾ ''تو ایک حَکَم مرد کے خاندان سے مقرر کرو اور ایک حَکَم عورت کے خاندان سے۔''

﴿اِنۡ يُّرِيۡدَاۤ اِصۡلَاحًا يُّوَفِّـقِ اللّٰهُ بَيۡنَهُمَا‌ؕ﴾ ''اگر وہ دونوں اصلاح چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔''

''اِنۡ يُّرِيۡدَاۤ اِصۡلَاحًا'' میں مراد زَوجین بھی ہو سکتے ہیں اور حکمین بھی۔ یعنی ایک تو یہ کہ اگر واقعتاً شوہر اور بیوی موافقت چاہتے ہیں تو اللہ ان کے درمیان سازگاری پیدا فرما دے گا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ شوہر اور بیوی دونوں کی خواہش ہوتی ہے کہ معاملہ درست ہو جائے‘ لیکن کوئی نفسیاتی گرہ ایسی بندھ جاتی ہے جسے کھولنا ان کے بس میں نہیں ہوتا۔ اب اگر دونوں کے خاندانوں میں سے ایک ایک ثالث آ جائے گا اور وہ دونوں مل بیٹھ کر خیر خواہی کے جذبے سے اصلاحِ احوال کی کوشش کریں گے تو اس گرہ کو کھول سکیں گے۔ یہ دونوں اسبابِ اختلاف کی تحقیق کریں گے‘ میاں بیوی دونوں کے گلے شکوے اور وضاحتیں سنیں گے اور دونوں کو سمجھا بجھا کر تصفیہ کی کوئی صورت نکالیں گے۔ ''اِنۡ يُّرِيۡدَاۤ اِصۡلَاحًا'' میں مراد حکمین بھی ہو سکتے ہیں کہ اگر وہ اصلاح کی پوری کوشش کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے مابین موافقت پیدا فرما دے گا۔ لیکن میرا رجحان پہلی رائے کی طرف زیادہ ہے کہ اس سے مراد میاں بیوی ہیں۔

﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيۡمًا خَبِيۡرًا‏ ﴿۳۵﴾﴾ ''یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ جانتا ہے اور باخبر ہے۔''

۞ ۞ ۞

روزہ اور بندگی کے معانی

حامد کمال الدّین

رمضان کی خوشبو فضا یوں تو کئی ایک پہلو سے عبارت ہے۔ روزہ' قیام' تہجد' ''مُستغفِرین بالاسحار''، دُعا' قرآن' سجود' آخری عشرہ' طاق راتیں' لیلۃ القدر' اعتکاف' مساجد کی آبادی' راتوں کی مناجات' تاریک گوشوں کی سرگوشی' صدقۃ الفطر' عید' عبادت گزاروں کی خوش لباسی' سجدے کرنے والوں کی خندہ روئی' موحدین کی تکبیر اور تہلیل' اجر کے لیے پراُمیدی...... یہ سب کچھ اس پرلطف موسم کا حصہ ہے' اور ہماری خواہش ہوگی کہ ان میں سے ہر پہلو پر ہی ہم کچھ بات کریں' مگر اس بار ہم صرف ''روزہ'' پر ہی کچھ گفتگو کرسکیں گے۔

روزہ صبر کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے۔

روزہ ایک ایسی عبادت ہے جس پر صبر کا ایک خاص اطلاق ہوتا ہے۔ رُکے رہنا' برداشت کرنا' ڈٹ جانا' منتظر ہونا' کمال انداز میں سہہ جانا...... جس کے پیچھے ایک عظیم ہستی کی چاہت ہو اور جس کی پشت پر کوئی اعلیٰ مقصد کارفرما ہو' صبر کہلاتا ہے۔ روزہ صبر ہی کی ایک صورت ہے' یہاں تک کہ متعدد احادیث میں رسول اللہ ﷺ رمضان کا ذکر ہی **شَھْرُ الصَّبْرِ** (صبر کا مہینہ)[(1)] کے نام سے کرتے ہیں۔ چنانچہ روزہ اور صبر قریب قریب ہم معنی ہو جاتے ہیں۔

اور جہاں تک صبر کی بات ہے تو وہ عبادت کی ایک بہترین صورت ہے۔ کسی نے ''بندگی'' کی تعریف یہ کی ہے:

> ''نفس انسانی کا معبودِ برحق کی طلب میں زندگی زندگی یوں چاہت اور رغبت اور دلجمعی سے بڑھتے جانا کہ ایک قدم صبر ہو تو ایک قدم شکر۔''

---

(۱) دیکھئے مسند احمد' ح۱۹۴۳۵' ۱۹۸۱۱۔ سنن النسائی' ح۲۳۶۶۔ سنن ابن ماجہ' ح۱۷۳۱۔ سنن ابی داوٗد' ح۲۰۷۳۔

روزہ صبر بھی ہے اور شکر بھی۔ پس آدمی کو چاہیے کہ عبادت کے ہر عمل میں بندگی کی اسی کیفیت کو ٹٹولتا رہے۔

صبر کی دو صورتیں ہیں: اضطراری اور اختیاری۔ روزہ کا شمار دوسری صنف میں ہوتا ہے۔

اضطراری صبر جانور بھی کرتے ہیں، کافر بھی کر لیتے ہیں، یعنی جہاں آدمی کا بس ہی نہ چلے وہاں ''صبر''۔ یہ عبادت نہیں مجبوری ہے۔ صبر جو عبادت ہے وہ ایک اختیاری فعل ہے۔ مؤمن کے پاس ایک ایسی چیز ہے جو اضطراری صبر کو بھی اختیاری بنا لیتی ہے۔ جہاں آدمی کا بس نہ چلے وہاں بھی دِل سے راضی ہونا اور مالک کی خوشی کو اپنی خوشی جاننا آدمی کا بہرحال اپنا اختیار ہے۔ پس صبر جہاں ایک جانور یا ایک کافر کے لیے مجبوری کی ایک صورت ہو مؤمن کے لیے وہاں بھی وہ ایک مجبوری نہیں رہتا بلکہ اختیاری فعل بن جاتا ہے۔ اسی لیے وہ اپنے اس فعل سے مالک کو خوش کرتا ہے۔ صبر دراصل یہ ہے کہ آدمی کو اپنی حدود اور خدا کے اختیارات معلوم ہوں۔ قدرتی اضطراری امور میں کچھ کر سکنا تو کافر کا بس ہے اور نہ مؤمن کا۔ دونوں اسی معنی میں صبر کرتے ہیں، مگر کافر کا صبر کوئی بہادری نہیں، البتہ مؤمن اپنے مالک سے اس پر خوب خوب داد پاتا ہے۔ توحید کا سراغ پا لینے سے انسان میں دراصل یہی فرق آ جاتا ہے۔

رہ گئی صبر کی اختیاری صورت، یعنی جہاں انسان کا بس چلتا ہو اور کچھ کرنے یا نہ کرنے پر اس کا پورا اختیار ہو وہاں انسان کا آپ اپنی مرضی سے اپنے آپ کو خدا کا محدود اور پابند کر لینا اور اس پابندی کو خوشی سے قبول کرنا اور پورے اعتماد سے سہہ جانا اور یہ کر کے اُس ذاتِ کبریائی کی نگاہ میں بچ جانا، تو یہ صبر کی ایک اعلیٰ اور برگزیدہ صورت ہے۔

صبر کا یہ مفہوم اگر واضح ہو جائے تو آپ دیکھتے ہیں کہ صبر دراصل عبادت اور بندگی کا ہی دوسرا نام ہے۔ پس صبر عبادت ہے اور عبادت صبر۔

﴿فَاعۡبُدۡهُ وَ اصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِهٖ﴾ (مریم:٦٥)

''پس تم اُس کی بندگی کرو اور اُسی کی بندگی میں صبر و ثابت قدمی اختیار کرو۔''

یہ ایک ادا ہے جس کا بدلہ حساب رکھے بغیر دیا جاتا ہے:

﴿اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوۡنَ اَجۡرَهُمۡ بِغَیۡرِ حِسَابٍ ﴿۱۰﴾﴾ (الزمر)

''یہ صبر کرنے والے ہی ہیں جو اپنا اجر بلاحساب پائیں گے۔''

((کُلُّ عَمَلِ ابۡنِ آدَمَ یُضَاعَفُ : اَلۡحَسَنَةُ عَشۡرُ اَمۡثَالِهَا اِلٰی سَبۡعِ مِائَةِ

ضِعْفٍ، قَالَ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ : اِلاَّ الصَّوْمَ، فَاِنَّهٗ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِهٖ ، یَدَعُ شَهْوَتَهٗ وَطَعَامَهٗ مِنْ اَجْلِیْ ......))[۱]

''آدم کا بیٹا اپنے ہر عمل کا کئی کئی گنا پاتا ہے۔ ایک نیکی دس گنا سے سات سو گنا تک جا پہنچتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کہتا ہے: سوائے البتہ روزے کے۔ یہ میرے لیے ہوا اور اس کا بدلہ بھی بس میرے ہی دینے کا ہے۔ بندہ اپنی لذت و مزہ اور اپنا کھانا پینا میری خاطر چھوڑ لیتا ہے۔''

یوں بندگی صبر اور صلوٰۃ سے عبارت ہے۔ سورۃ البقرۃ جس میں پانچوں ارکانِ اسلام کا خوب خوب ذکر ہے اور اس انداز کی جامعیت رکھنے میں قرآن کی یہ ایک منفرد ترین سورت ہے، صبر اور صلوٰۃ کا دوبارا کٹھا ذکر کرتی ہے:

﴿وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِیْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِیْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾﴾ (البقرۃ)

''اور صبر اور نماز کے ساتھ مدد طلب کرو۔ یہ چیز شاق ہے، مگر ڈر رکھنے والوں پر۔ جو سمجھتے ہیں کہ انہیں اپنے ربّ سے ضرور ملنا ہے اور اُسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔''

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ﴿۱۵۳﴾﴾ (البقرۃ)

''اے ایمان والو! صبر (ثابت قدمی) اور نماز کے ذریعے مدد چاہو۔ یقیناً اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

چنانچہ صبر اختیاری کی ایک بہترین صورت روزہ ہے۔ بلکہ روزہ صبر اختیاری کی ایک بہترین مشق بھی ہے۔ سب کچھ انسان کے پاس ہے، نفس میں اس کی طلب بھی خوب ہے، ضرورت بھی ہے، مگر انسان آپ ہی اپنے اختیار سے اور اللہ تعالیٰ کی محبت میں اس سے یوں پرہیز کیے ہوئے ہے گویا یہ کوئی فرشتہ ہے۔ کیونکہ یہ بندگی کے ایک خاص مفہوم کا مجسم عکس بننا چاہتا ہے اور بھوک پیاس کی اسی کیفیت میں خوشی خوشی دن پار کر دیتا ہے۔ مگر اس کا یہ فعل رزق سے بے رغبتی نہیں بلکہ رازق سے اپنی رغبت بتانے کا ایک طریقہ ہے اور ایک مشروع طریقہ ہے۔ رزق سے بے رغبتی ہوتی تو یہ صبح پو پھٹنے سے بھی پہلے اُٹھ بیٹھنے کا روادار نہ ہوتا اور رات

(۱) صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب فضل الصیام، ح ۱۹۴۵۔

کے اس آخری پہر میں اللہ کا رزق کھانا اور اس پر اس کا شکر کرنا یہ اپنے حق میں باعثِ برکت نہ جانتا اور نہ سورج چھپتے ہی ایک لمحہ تاخیر کیے بغیر اللہ کا نام لے کر اللہ کا رزق کھانے اور اس کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کا اس کو حکم ہوتا۔

یہ رزق سے بے اعتنائی نہیں ہے' یہ کوئی منفی رویہ نہیں۔ یہ دراصل رازق کی طمع اور چاہت ہے۔ یہ کھانے پینے سے بے نیازی نہیں بلکہ کھلانے والے کو کھانے پر ترجیح دینے کا ایک اظہار ہے۔ کھانا پینا اگر ایک زبانی بات نہیں بلکہ ایک باقاعدہ عمل ہے تو رازق کو رزق پر مقدم جاننا بھی پھر زبانی بات نہیں بلکہ ایک باقاعدہ عمل ہونا چاہیے اور عمل سے ہی ثابت کر دی جانے والی بات۔ رازق کو رزق پر ترجیح دینے کی ایک عملی صورت اگر زکوٰۃ اور صدقہ ایسی مالی قربانی ہے تو اس کی ایک دوسری صورت روزہ رکھ کر...... طویل ساعتیں آپ اپنی مرضی سے بھوکا اور پیاسا رہ کر مالک کے لیے اپنے لطف اور لذت کی قربانی ہے۔

ان سب جہتوں سے انسان اپنے آپ کو رضا کارانہ خدا کا پابند کرتا ہے اور اپنی بندگی کا یہ پیغام دے کر اس سے اس کے فضل کا خواستگار ہوتا ہے' حالانکہ یہ پابندی اختیار نہ کرنے کی اس کو زندگی پوری آزادی ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ روزہ صبر اختیاری کی ایک کامل ترین عکاسی ہے اور صبر اختیاری کی ایک زبردست مشق۔

شکر ایک دوسری بڑی عبادت ہے' روزہ جس کا ایک اظہار بنتا ہے۔ دیکھا جائے تو شکر بندوں کے ہاں پایا جانے والا ایک نادر ترین عمل ہے۔ انسان صبر کر لینے پر تیار ہو جاتا ہے مگر شکر کی جانب بہت کم متوجہ ہوتا ہے۔ کہنے کو صبر مشکل ہے اور شکر آسان' مگر عملاً صورت حال اس کے برعکس ہے۔

شکر بنیادی طور پر نعمت کی قدر دانی ہے اور منعم کی احسان مندی۔ نعمت سے انسان کی لطف اندوزی عموماً اس کو نعمت کی قدر دانی اور منعم کی احسان مندی کی جانب متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ اس کی نوبت عموماً تب آتی ہے جب وہ نعمت ہی سرے سے جاتی رہے۔ مگر یہ صبر کا موقع ہوتا ہے۔ البتہ اگر آپ کے اور ان نعمتوں میں سے کسی ایک کے مابین جو آپ کو لاتعداد حاصل ہیں محض ایک وقتی فاصلہ آ جائے تو آپ نعمتوں کی قدر بھی کر لیتے ہیں اور منعم کے فضل کا اعتراف بھی خوب کرتے ہیں جبکہ اس نعمت سے بھی آپ محروم نہیں ہوئے ہوتے۔ ایک چیز

آپ کے پاس بھی رہی اور آپ اسے کھو کر دوبارہ پا لینے کی کیفیت سے بھی گزر گئے۔

اس لحاظ سے روزہ صبر ہی نہیں، شکر بھی ہے۔ آپ کی یہ بھوک اور پیاس جو آپ نے خود اپنی مرضی سے مالک کی خاطر اختیار کی اس کے شکر و احسان مندی کی بھی یاد دہانی بن جاتی ہے۔ کسی نعمت کے یاد آنے کے لیے اس سے کچھ فاصلہ ہو جانا بسا اوقات ضروری ہو جاتا ہے۔ روزہ اس بات کا ایک قدرتی انتظام ہے بلکہ اس طرزِ احساس کی ایک زبردست مشق بھی۔ آپ کا روزہ رکھنا اگر ایک مشینی عمل نہیں تو کچھ گھنٹوں کی بھوک اور پیاس آپ کے حق میں ایک بہت ہی بامعنی چیز ہے۔ یہ آپ کو بار بار کچھ پیغام دیتی ہے اور آپ کو بندگی کے کچھ ایسے نفیس معانی بیان کر کے دیتی ہے جس کا بیان کرنا کسی اور چیز کے بس میں نہیں۔

تیسری چیز فقر ہے۔

﴿یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَی اللّٰہِ وَاللّٰہُ ھُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ﴾ (فاطر)

''لوگو! تم ہی اللہ ہی کے محتاج ہو، اور اللہ ہی ہے جو بے نیاز ہے اور آپ اپنی ذات میں حمد کے لائق۔''

فقر بندگی کا ایک زبردست موضوع ہے، بلکہ فقر ہی بندگی ہے۔ انسان کیا ہے؟ محتاجیوں اور ضرورت مندیوں کا مجموعہ۔ اپنی یہ حقیقت پہچاننا، اس کا اعتراف اور احساس کرنا بندگی کا ایک زبردست عمل ہے۔ دوسری طرف اللہ تعالیٰ کو ہر ضرورت سے بے نیاز اور ہر نقص سے مبرا جاننا اور یوں اُس کو خود اُس کی ذات میں قابل ستائش مان کر اُس کی حمد کرنا عبادت کی ایک اعلیٰ صورت ہے۔

ان دونوں باتوں میں براہِ راست تعلق ہے۔ جس قدر انسان اپنے فقر اور احتیاج کا احساس کرتا ہے اتنا ہی وہ خدا کی بے نیازی کا معترف ہوتا اور اس کی مطلق حمد کا دم بھرتا ہے۔ جس قدر وہ خدا کے غنی اور بے نیاز ہونے کی حقیقت سے آشنا ہوتا ہے اتنا ہی وہ اپنی اور سب مخلوق کی خدا کے آگے محتاجی اور ضرورت مندی کا معترف ہوتا ہے اور اسی قدر اس پر خالق اور مخلوق کی حقیقت کا یہ فرق واضح ہو جاتا ہے۔ نہ صرف خالق اور مخلوق کا یہ فرق ظاہر ہوتا ہے بلکہ خالق اور مخلوق کا یہ تعلق بھی واضح ہوتا ہے کہ ایک بے نیاز اور دوسرا اُس کا محتاج، ایک غنی اور دوسرا اُس کے در کا فقیر۔ چنانچہ آدمی کا اپنے آپ کو فقیر اور محتاج جاننا اور اللہ تعالیٰ کے غنی اور

بے نیاز ہونے کا معترف ہونا ایک محنت طلب کام ہے اور دل کا ایک مسلسل عمل۔

البتہ انسان بہت جلد بھول جانے والا ہے۔ اس کی ضرورت پوری ہو تو یہ اپنا فقر بھول جاتا ہے۔ اس کی مراد بر آئے تو اس کی یہ حقیقت کہ یہ محتاجیوں کا مجموعہ ہے' اس کی نگاہ سے ہی روپوش ہو جاتی ہے۔ ایک شکم سیر کو ''بھوک'' کا تصور کرنا بہت ہی دشوار ہو جاتا ہے۔ پیٹ بھرا نہیں کہ ضرورت مندی کا تصور ہی چلا گیا! اب جب تک دوبارہ بھوک نہیں لگتی یہ بھلا چنگا ہے! یہ لمحۂ حاضر کا اسیر جاہلِ محضُ ہے' ظلوم اور جھول۔ تب اس میں تونگری اور بے نیازی آتی ہے جو کہ دراصل خدا کی صفت ہے اور صفتِ بندگی کے سراسر منافی۔ انسان کا بے نیاز ہونا اور اپنے آپ کو غیر ضرورت مند جاننا دراصل اپنی اوقات بھول جانا ہے۔ یہ دہری جہالت ہے۔ ایک اس کا اپنے آپ کو محتاج نہ جاننا اور دوسرا کسی مہربان کے ہاتھوں اپنی ضرورت پوری ہو جانے کو بے نیازی کے مترادف جان لینا۔ جو اپنی صفت سے ناآشنا رہے وہ خدا کی معرفت بھی کبھی نہیں پاتا۔ اپنی ''بندگی'' اور ''عاجزی'' سے ناواقف' خدا کی ''خدائی'' اور ''بے نیازی'' کا کیونکر معترف ہوگا! ایسے آدمی کی نگاہ میں ''بندگی'' اور ''خدائی'' کے مابین بہت ہی تھوڑا فرق رہ جائے گا' جو ممکن ہے کہ پلک جھپکنے میں جاتا رہے۔ شرک کر لینا بھی لوگوں کے لیے تبھی آسان ہو جاتا ہے۔

اسلامی عبادات ساری کی ساری دراصل اسی فقر کا اظہار ہیں' مخلوق کی اسی صفت کا اقرار ہیں۔ بندگی کا ہر عمل اللہ تعالیٰ کے غنی مطلق ہونے اور لائق حمد ہونے کا اعتراف ہے۔ نماز ہے تو تب' دعا ہے تو تب' تسبیح ہے تو تب' اور ذکر ہے تو تب۔ سب اسی حقیقت کا اعادہ ہے۔ البتہ روزہ اس حقیقت کا ایک بہت ہی منفرد اظہار ہے۔ روزہ ایک موحدّ کی زبان پر اس کے اس فقر کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ روزہ کی صورت میں ایک موحد کا رُواں رُواں یہ بولتا ہے کہ وہّ مجسم احتیاج ہے اور اُس ذات کا سدا محتاج جو ہر عیب سے پاک' ہر ضرورت سے بے نیاز' غنی مطلق' لائق حمد اور اَحد اور صمد ہے' اور جس کے آگے ہر مخلوق اپنی ضرورت کے لیے دستِ سوال دراز کرتی اور ایک اسی کے فضل کے سہارے جیتی ہے' اور جس کے در کا یوں محتاج ہونا کہ اس کی محتاجی اس کے ماسوا ہر ہستی سے اس کو بے نیاز کر دے نہ صرف فضیلت کی بات ہے بلکہ انسان کی اصل دولت اور سرمایہ ہے۔ پس روزہ ایک انداز کی تسبیح ہے۔ یہ اپنے فقر کا بیان ہے اور خدا کے بے عیب اور بے نیاز ہونے کا اقرار اور اس کے فضل کا اعتراف اور اس کی احسان مندی کا

اظہاراوراس کی دین پر قناعت اوراس سے مانگنے کا ایک اسلوب۔

چنانچہ روزہ اس صفتِ بندگی کا اقرار ہے۔ یہ انسان کے فقر کا بیان ہے۔اس کا مدعا یہ ہے کہ بندہ بھوکا ہے —— اور بھوک بندے کی صفت ہے —— جب تک کہ خدا اُس کو نہ کھلائے' اور یہ کہ پاکی اور تعریف اُس کی جو اس کی اس بھوک کا علاج اپنے پاکیزہ رزق سے کرتا ہے' اور یہ کہ تعریف اُس کی تب بھی جب بندہ بھوکا ہو اور تعریف اس کی تب بھی جب بندہ اس کا رزق کھائے اوراس رزق سے اپنی بھوک اور پیاس بجھائے۔سو یہ ایک بے لوث تعلق ہے۔گو یہ ایک محتاج اور ایک غنی کا تعلق ہے اور گو یہ اُس کے فضل کا ہر دم سوالی ہے مگر اس کو یہ ظرف بھی نصیب ہوا ہے کہ اس کے لیے اس کی تعریف کرنا کچھ پیٹ بھرنے پر موقوف نہیں! سبحان اللہ! روزہ کیسی خوبصورت عبادت ہے! خدا کی تسبیح' خدا کی بندگی' خدا کی حمد اور خدا کی فرمانبرداری کچھ اس کی شکم سیری پر منحصر نہیں۔ یہ بھوکا رہ کر بھی اُس کی ویسی ہی حمد اور تعریف کرے گا جیسی کہ شکم سیر ہو کر۔اس لیے کہ وہ آپ اپنی ذات میں قابلِ ستائش ہے اور لائق حمد' اور یہ آپ اپنی ذات میں احسان مند اور اُس کا ثنا خوان! وہ دے تو اُس کے دینے پر اس کی تعریف' وہ کبھی کسی وقت نہ بھی دے تو اُس کی حکمت پر پیشگی اعتماد اور اُس کی دانائی پر اُس کی تعریف اور اُس کے فیصلے پر کامل اطمینان' اوراس سے بھی بہتر صلہ پانے کی اُس سے اُمید اور آس۔وہ دے کر کھانے سے روک دے تب بھی اُسی کی تعریف اوراس کا حکم بسر و چشم! ﴿وَلَهُ الْحَمْدُ فِي الْأُولَىٰ وَالْآخِرَةِ وَلَهُ الْحُكْمُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ﴾ (القصص)

پس یہ ایک غیر مشروط بندگی ہے۔ ہر حال میں خدا کی تعریف اور خدا کی احسان مندی ہے اور خدا کی طلب میں سچا ہونے کی ایک عاجزانہ مگر ایک عملی تعبیر۔

روزہ اگر میکانکی عمل نہیں بلکہ ایک شعوری عمل ہے اور ایمان اور احتساب کا پیدا کردہ ہے تو انسان کی بھوک اور پیاس ان سب احساسات کی ایک خاموش مگر خوبصورت زبان بن جاتی ہے۔انسان سارا دن ان احساسات کو پالتا اور بڑھاتا ہے اوراسی کیفیت میں صبح سے شام کر لیتا ہے۔یوں ایک مہینہ وہ یوں گزارتا ہے کہ صبح چڑھتے ہی ایمان کا یہ سبق بیک وقت شعور اور عمل کی زبان میں یاد کرنے لگتا ہے اور شام ڈھلنے تک اسی سبق کو یاد کیے چلے جاتا ہے۔ یہ سبق ایک بار ذہن نشین ہو جائے تو بھوک اور پیاس میں خدا نے کچھ ایسی خاصیت رکھی ہے کہ یہ خود ہی اس سبق کی یاددہانی بنتی ہے۔یہ ایک قدرتی انتظام ہے کہ دن کا زیادہ سے زیادہ حصہ انسان

اس سبق کے یاد کرنے میں گزارے۔ جیسے جیسے بھوک پیاس میں شدت آتی ہے ویسے ویسے ہی یہ سبق یاد ہونے لگتا ہے اور اسی نسبت سے ایمان کی یہ غذا اس کی روح میں اترتی ہے۔ جس شخص کی بھوک اور پیاس کو ایسی خوبصورت زبان مل جائے اور وہ اس کے لیے اتنے سارے پیغام نشر کرے وہ مالک کی نگاہ میں بھلا کیوں نہ جچے گا؟ اب حال یہ ہوتا ہے کہ اس کے منہ کی ناخوشگوار بو خدا کے ہاں مشک کی خوشبو سے بڑھ جاتی ہے۔

اب ہمارے پاس تین چیزیں ہوگئیں جو اس عبادت —— روزہ —— کی تہہ میں کام کرتی ہیں: صبر' شکر اور فقر۔ چوتھا عنصر اس میں ایک اور شامل ہونا ہے اور وہ ہے ذکر۔

آدمی ایمان کا مفہوم نہ جان پایا ہو تو ''ذکر'' اس کے لیے بڑی حد تک ایک ناقابلِ فہم چیز ہے اور یا پھر ایک بناوٹی عمل۔ ''ضربوں'' کی نوبت عموماً تبھی آتی ہے۔ خدا کا درست تعارف ہو جانا' خدائی کی حقیقت سے آگاہ ہو جانا' بندگی کا مطلب جان لینا' اللہ تعالیٰ سے ایک عہد بندگی استوار کر لینا' دنیا و آخرت کی حدود جان لینا اور اپنے آپ کو اللہ کی عبادت میں دے کر اس کی تعظیم و تسبیح اور اس کی کبریائی کرنے لگنا' اُس کو اُس کی نشانیوں سے پا لینے کا سلیقہ جاننا' اُس کی صفات کا علم پانا' اُس کی خدمت اور اطاعت پر ہمہ دم تیار رہنا' عبادت اور اطاعت پر ایک اُس کا حق جاننا اور طاغوت سے کھلا کفر کرنا' الوہیت اور کبریائی میں اُس کی اَحدیت کے بار بار ذکر سے ایک خوشی اور ایک اطمینان محسوس کرنا اور نفس میں اس پر اعتماد پانا' غرض رسولوں کی دعوت کو اپنا ایک بے ساختہ مقدمہ بنا لینا اور قرآن کے بنیادی مضامین کو اپنا باقاعدہ مدعا بنا لینا' یہ ہے ایمان اور یہ ہے اسلام کی حقیقت۔ سب سے پہلے آدمی کو اسی پر محنت کرنا ہے اور اپنے نفس کی گہرائی میں اس کو قبول کرنا ہے ﴿وَلَمَّا يَدۡخُلِ الۡاِيۡمَانُ فِیۡ قُلُوۡبِكُمۡ﴾ (الحجرات:١٤) پھر جب قرآن سے اور رسول اللہ ﷺ کے مقدمہ دعوت سے ایک بار یہ سبق پڑھ لیا جائے تو پھر باقی زندگی اس سبق کا اعادہ کیا جائے گا' قول سے' عمل سے' شعور سے' احساس سے اور ہر انداز سے۔ جس کثرت سے ہو سکے اس کا اعادہ کیا جائے گا۔ اس ''اعادہ'' کو ہی ذکر کہا جاتا ہے۔

جس نے اصل سبق ہی نہیں پڑھا اور اس کا مفہوم ہی نہیں سمجھا وہ سبق کا ''اعادہ'' کیا کرے گا؟ ''ذکر'' اس کے لیے ایک تکلف ہے۔ وہ ضرور اس کی کوئی غیر طبعی صورت اختیار

کرے گا اور بہتوں کے ساتھ عملاً اور واقعتاً یہی ہوتا ہے۔ پس اس کا طریقہ یہی ہے کہ آدمی بہت پیچھے چلا جائے اور اپنی محنت کا آغاز ایمان کے مفہوم' اسلام کے مطلب' توحید کی حقیقت' خدا کی پہچان' صفات کے علم اور بندگی کا معنی جاننے سے کرے' اور پھر ذکر کی صورت میں اپنے اس ایمان اور بندگی میں ساری زندگی اس رنگ کو گہرا کرتا رہے۔

اب یہ ذکر کیا ہے؟ یعنی بندگی کے اس سبق کا اعادہ اور تذکرہ کیونکر ہوگا؟ دُعا' مناجات' تسبیح' حمد' تعظیم' تکبیر' تہلیل' قیام' رکوع' سجود' تحیاتؔ' اللہ تعالیٰ کے خوبصورت نام لینا اور اُس کی صفات کا تذکرہ کرنا۔ علم' فکر' توبہ' انابت' استغفار' خشوع' اُمید' آس' خشیت' خوف' استعاذہ' آہ' بکا' تسلیم' رضا...... یہ سب افعال اور یہ سب احساسات ذکر ہیں اور اس اصل حقیقت کی تذکیر جو ایمان کے مفہوم میں پہلے جان لی گئی اور لَا اِلٰـهَ اِلَّا اللّٰہ کی صورت میں تسلیم کی گئی......

کوئی اگر ایمان کا پورا سبق دہرانا چاہے اور اپنے معبود کا ایک بہترین ذکر کرنا چاہے اور بندگی کی یہ حقیقت اپنے اوپر طاری کر رکھنے میں پوری طرح راغب ہو تو اس کو چاہیے قرآن پڑھے۔ یہ بہترین ذکر ہے۔ ایمان کا ہر مفہوم اس میں بار بار اور آپ سے آپ دہرایا جاتا ہے اور نئے سے نئے پیرائے میں بیان ہوتا ہے۔

چونکہ نماز ایک ایسا عمل ہے جس میں ''ذکر'' کے بے شمار افعال ایک بے مثال انداز میں یکجا کر دیے گئے ہیں' بلکہ یوں کہیے کہ ذکر کے قریب قریب سب افعال ہی ملا جلا کر ایک عمل میں سمو دیے گئے ہیں اور جس سے کہ یہ ایک ایسا سماں بنتا ہے کہ انسان کا پورا وجود ہی دنیا و مافیہا سے رخ پھیر کر ایک خدائے وحدہٗ لاشریک کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ اس میں انسان کا انگ انگ اللہ کا ذکر کرتا ہے۔ انسان کا دل' انسان کی زبان' ہونٹ' ہاتھ' پیر' حتیٰ کہ ہاتھوں پیروں کی انگلیاں' گھٹنے' ناک' پیشانی' سر' کمر' زانو' غرض سب اعضاء خدا کا ذکر کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ نگاہیں جھک جاتی ہیں اور ادب اور خضوع میں آ کر خدا کی تعظیم کرتی ہیں۔ انسان کے کان تک دنیا کی ہر بات سننے سے انکاری ہو کر ایک خدا کا کلام اور ذکر سننے کے ہی روادار رہ جاتے ہیں۔ خدا کی بار بار تعظیم ہوتی ہے۔ خدا کی بڑائی بیان کی جاتی ہے۔ حمد و ثنا ہوتی ہے۔ خدا کے کلام کی تلاوت ہوتی ہے۔ نماز خدا کے آگے قیام ہے' رکوع ہے' سجود ہے' انسان خدا کے آگے بار بار ماتھا دھرتا اور اس کی عظمت کو سلام کرتا ہے۔ تحیات اور کورنش ہے' تسبیح ہے' تہلیل ہے' دُعا ہے' مناجات ہے' خدا کے ناموں کا وِرد ہے۔ استغفار' انابت' توبہ' خشوع' اذعان' تسلیم' امید' آس'

درخواست، منت، سماجت، خوف، خشیت، استعاذہ حتیٰ کہ بسا اوقات آہ، بکا اور گریہ...... غرض انسان ہر پہلو سے اور ہر شکل میں اللہ کا ذکر کرتا اور اُس کے آگے اپنی بندگی بیان کرتا ہے۔ اس لیے نماز ذکر کی بہترین حالت ہے۔ حتیٰ کہ قرآن جو کہ بہترین ذکر ہے، کا بھی بہترین مقام نماز ہے۔ پس نماز علی الاطلاق ذکر کی بہترین حالت ہے۔

﴿وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکۡرِیۡ ﴿۱۴﴾﴾ (طٰہٰ)

''اور میری یاد کے لیے نماز قائم رکھ۔''

﴿اُتۡلُ مَاۤ اُوۡحِیَ اِلَیۡکَ مِنَ الۡکِتٰبِ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ ؕ اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنۡہٰی عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡکَرِ ؕ وَلَذِکۡرُ اللّٰہِ اَکۡبَرُ ؕ﴾ (العنکبوت:٤٥)

''تلاوت کرو اس کتاب سے جو تم پر وحی کی گئی اور نماز کی اقامت کرو، یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے، البتہ اللہ کا ذکر اس سے بھی بڑی چیز ہے۔''

پس روزہ جو کہ صبر کی بہترین حالتوں میں سے ایک حالت ہے اور نماز جو کہ ذکر کی ایک بہترین صورت ہے، جب مجتمع ہوں ...... اور رمضان ان دو عبادتوں کے اجتماع کی بہترین صورت ہے ...... تو یوں رمضان کے دن اور رمضان کی راتیں بہت بامعنی ہو جاتی ہیں اور ﴿وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ﴾ کی ایک عملی تفسیر۔

ذکر کی بہترین حالت گو نماز ہے مگر روزہ بھی ذکر ہی کا ایک ذریعہ ہے، بشرطیکہ روزہ سے آدمی وہ پیغام لینے کا شعور پائے جو کہ روزہ سے اس کا اصل مقصود ہے۔ اس بات کا اب یہاں کچھ بیان کیا جاتا ہے۔

بھوک اور پیاس انسان کے محسوسات میں قوی ترین ہیں۔ جنسی خواہش ایک مضبوط ترین جبلت ہے۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ انسان کے اندرونی محسوسات ہیں نہ کہ خارجی عوامل۔ خارج سے انسان کو کرائی جانے والی یاددہانی ہرگز اس قدر مؤثر نہ ہوگی جس قدر کہ یاددہانی کے اندرونی اسباب۔ انتڑیاں خالی ہوں تو وہ بہرحال انسان سے کھانا مانگتی ہیں اور جب تک کھانا مل نہ جائے تب تک بولتی ہیں۔ بھوک کی بہرحال ایک کھینچ پڑتی ہے۔ پیاس بار بار اپنا آپ یاد دلاتی ہے۔ اس کے جواب میں آدمی جب اپنے آپ کو یہ بتاتا ہے کہ اُس کی اس بھوک پیاس کا سبب یہ نہیں کہ وہ کھانے پینے کے لیے کچھ پاس نہیں رکھتا بلکہ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ خدا کی بندگی پر مامور ہے...... اور یہ کہ خدا کا اس نے یہ مرتبہ اور مقام جان رکھا ہے کہ وہ

جب چاہے اس کے اور اس کے مرغوباتِ نفس کے مابین حائل ہو جائے‘ چاہے نفس کے وہ مرغوبات اس کی پوری دسترس میں ہوں اور یہ کہ خدا کے اس حق کو وہ اپنے لیے سعادت سمجھ کر اور خوشی خوشی قبول کرے...... اور یہ کہ اس کی نگاہ میں معبود کی خواہش اس کی اپنی خواہش پر کہیں بڑھ کر مقدم ہے اور اس کا یہ روزہ دراصل اسی بات کا ہی عملی ثبوت ہے...... اور یہ کہ مالک کے پاس جو کچھ ہے وہ اس سے کہیں بہتر ہے جو اس کے اپنے پاس ہے‘ بلکہ اِس کا اور اُس کا میل ہی کیا! یوں روزہ اور روزہ کا ہر ہر لمحہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دیتا ہے اور پورا دن اس بات کی مشق کرتا اور اس سبق کا اعادہ کرتا ہے: ﴿وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى﴾ (الضحیٰ) سو یہ ایک ذکر ہے جو انسان لب ہلائے بغیر کرتا ہے اور پورا دن اس میں گزار دیتا ہے!

سبحان اللہ! بھوک اور پیاس کا ایسا استعمال کسی دین اور کسی فلسفۂ اخلاق نے نہ کرایا ہوگا جیسا کہ شریعتِ اسلام نے کرایا: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ﴾ (البقرۃ) بھوک اور پیاس اور جنسی تسکین کی خواہش جس انداز سے ایک قدرتی عمل ہے اور اس کی بابت انسان کو کسی کے ’’یاد‘‘ کروانے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ انسان کو آپ اپنی طرف متوجہ کرتی اور آپ اپنی یاد دلاتی ہے‘ اس کے اسی قدرتی زور کو اسلام اپنے رُخ پر لے آتا ہے اور اس کی تمام تر شدت کو بہت خوبصورتی سے اپنے حق میں استعمال کرتا ہے۔ جیسے ہی انسان کی حیوانی خواہشات نے زور مارا ویسے ہی انسان کی روحانی قوت اور فکری مزاحمت حرکت میں آ گئی! جونہی جسم کی کسی جبلت نے اپنا قدرتی عمل کیا ویسے ہی دل و دماغ نے ایک شعوری عمل کا آغاز کر دیا۔ جسم انسان کو اپنی وقتی ضرورت بتائے گا اور انسان اس کو اپنی ابدی ضرورت اور اپنی بندگانہ حیثیت بتا کر خاموش کرائے گا۔ نہ جسم اپنا کام کرنے اور اپنی خواہش بتانے سے رکے اور نہ قلب و ذہن کو اپنے اس شعور اور روحانی عمل سے فراغت ہو۔ یوں دن کی طویل ساعتیں انسان کے ملکوتی خصائص اس کے بہیمی خصائص پر پوری طرح حاوی رہتے ہیں اور اسی کیفیت میں انسان صبح سے شام کر لیتا ہے......

تا آنکہ افطار کا وقت آتا ہے۔ افطار وہ منفرد ’’کھانا‘‘ ہے جو انسان اپنی مرضی سے مؤخر نہیں کر سکتا۔ گویا اب یہ اس کی ضرورت نہیں‘ یہ بھی اس کو مالک ہی کا حکم ہے! یہ شخص جو پورا دن صبر اور استقامت اور عفت اور وقار کا نمونہ بنا رہا‘ افطار کے لیے اس کی رغبت اور عجلت بھی اب دیدنی ہے! پورے دن کے اس طویل تربیتی عمل کے بعد کم از کم اس وقت یہ ضروری ہو جاتا ہے

کہ اس کا کھانا اور پینا محض جسم کے مطالبہ کی تنفیذ نہ ہو بلکہ اس بار یہ حکم اس کو اوپر سے ہی ملے! کیوں!؟

تاکہ واضح ہو کہ مسئلہ دراصل ''حکم'' کا ہے......

تاکہ واضح ہو کہ یہ ایک بھرپور انسان ہے اور کھانا اس نے کسی بے دلی یا بے رغبتی یا دنیا بیزاری کے باعث نہیں چھوڑ رکھا تھا بلکہ معاملہ یہ ہے کہ اس کی رغبت ''دنیا'' سے بڑی ہے اور وہ رغبت اب بھی کہیں نہیں گئی ہے......

تاکہ واضح ہو کہ یہ کوئی ترکِ دنیا کا مظاہرہ نہ تھا بلکہ کسبِ آخرت کا عمل تھا......

اور تاکہ اس کو یا کسی اور کو یہ غلط فہمی نہ ہو جائے کہ ''بھوک'' میں خود اپنے اندر کوئی خوبی ہے......

بھوکا رہنا فی نفسہٖ کوئی بہادری نہیں۔ پیاسا رہنے کی خود اپنے آپ میں کوئی فضیلت نہیں۔ وہ اخلاقی فلسفے جو بھوک اور پیاس کی کچھ فی ذاتہٖ فضیلت بتاتے ہیں وہ دراصل فضیلت کی کوئی بنیاد بھوک اور پیاس کے سوا اپنے پاس نہیں رکھتے۔ یہ مفلس ادیان ہیں۔ بھوک کو فضیلت بخش دینے والی کوئی چیز ہے تو وہ ربّ العالمین کی بندگی ہے۔ اور جب فضیلت کی اصل بنیاد یہ بندگی ہے تو پھر یہ جہاں بھی پائی جائے' یہ بھوک پر صادق آئے تو بھوک عبادت اور کھانے پینے پر صادق آئے تو کھانا پینا عبادت!

سبحان اللہ! ضرورت آدمی کی اپنی اور حکم خدا کا! تاکہ واضح ہو کہ مالک اپنے بندے کی ضرورت سے غافل نہیں' بلکہ بندے کی ضرورت کا اُس کو بندے سے بڑھ کر پاس ہے......اور جو آج اپنے بندے کی ضرورت سے غافل نہیں وہ کل اپنے بندے کے لیے اپنے پاس کیا کچھ نہ رکھتا ہوگا جب بندہ محض ایک دن کا روزہ نہیں بلکہ عبادت کی پوری زندگی گزار کر اس کے روبرو ہوگا اور جس کو کہ اس نے نام ہی ''صلے کا دن'' دیا ہے اور جو کہ ہمیشگی کا دن ہے! یہی وجہ ہے کہ ''روزہ کھلنے'' اور ''خدا سے ملنے'' کا ایک ساتھ ذکر ہوتا ہے:

((لِلصَّائِمِ فَرْحَتَانِ : فَرْحَةٌ عِنْدَ فِطْرِهٖ وَفَرْحَةٌ عِنْدَ لِقَاءِ رَبِّهٖ)) (۱)

''روزہ دار کے نصیب میں دو خوشیاں ہیں: ایک خوشی اس کی روزہ کھولنے کے وقت اور ایک خوشی اپنے ربّ سے ملاقات کے وقت۔''

چنانچہ افطار کی محض ''اجازت'' نہیں بلکہ ''ہدایت'' ہوتی ہے! تاکہ بندہ اپنی بندگی کو کسی

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الصیام' باب فضل الصیام' ح ۱۹۴۵۔

ایک ہی صورت میں محصور نہ سمجھ لے......اور تا کہ بندگی کا ایک خوبصورت مضمون محض اپنے ایک پیرائے کی اوٹ میں نہ چلا جائے ......اور تا کہ بندہ اپنے مالک کا صحیح تعارف بھی کر لے جو صرف ''پابندیاں'' نہیں لگا تا بلکہ فضل بھی کرتا ہے۔ بلکہ اس کی عائد کردہ ''پابندیاں'' سب کی سب اس کے لامتناہی فضل کا ہی پیش خیمہ ہیں......اور تا کہ اس پر ایمان اور بندگی کا ایک اور لطیف معنی بھی واضح ہو اور وہ یہ کہ خدا کو پانا ''عمل'' کے زور پر نہیں بلکہ خدا کے آگے عاجزی اور انکساری اختیار کرنے میں ہے اور مطلق اس کے فضل اور رحمت کا سہارا چاہنے میں:

((وَاعۡلَمُوۡا اَنَّـهٗ لَنۡ يَنۡجُوَ اَحَدٌ مِنۡكُمۡ بِعَمَلِهٖ)) قَالُوۡا: يَارَسُوۡلَ اللّٰهِ وَلَا اَنۡتَ؟ قَالَ: ((وَلَا اَنَا ' اِلَّا اَنۡ يَتَغَمَّدَنِيَ اللّٰهُ بِرَحۡمَةٍ مِنۡهُ وَفَضۡلٍ))(۱)

''خوب جان لو! تم میں سے کوئی بھی محض اپنے عمل سے پار نہ لگے گا''۔ صحابہؓ نے عرض کی: یارسول اللہﷺ! کیا آپ بھی؟ فرمایا: ''ہاں میں بھی' سوائے یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی اپنی رحمت اور فضل سے مجھ کو اپنی لپیٹ میں لے لے''۔

پس روزہ عاجزی ہے اور ''بندگی'' کی ایک منفرد یاددہانی۔ سحری میں تاخیر اور افطار میں عجلت روزہ کے اندر بندگی کا رنگ بھر دینے اور بندگی کی اس تصویر کو مکمل کر دینے میں بے حد اہمیت کی حامل ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی ایک ایک بات میں بندگی کے بے شمار مضامین پوشیدہ ہیں۔ **وَخَيۡرُ الۡهَدۡيِ هَدۡيُ مُحَمَّدٍ ﷺ وَشَرُّ الۡاُمُوۡرِ مُحۡدَثَاتُهَا**......

۞۞۞

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب صفة القيامة والجنة والنار' باب لن يدخل احد الجنة بعمله برحمة الله تعالىٰ' ح ۵۰۴۱۔

عَنۡ اَبِيۡ هُرَيۡرَةَ رَضِيَ اللّٰهُ عَنۡهُ قَالَ: قَالَ رَسُوۡلُ اللّٰهِ ﷺ:

((مَنۡ لَمۡ يَدَعۡ قَوۡلَ الزُّوۡرِ وَالۡعَمَلَ بِهٖ وَالۡجَهۡلَ' فَلَيۡسَ لِلّٰهِ حَاجَةٌ فِيۡ اَنۡ يَّدَعَ طَعَامَـهٗ وَشَرَابَـهٗ)) (رواه البخاری وابو داؤد والترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

''جو آدمی گناہ کی بات اور گناہ کے کام سے باز نہیں آتا' جہالت اور بدتمیزی بھی نہیں چھوڑتا' تو اللہ کو یہ حاجت نہیں کہ ایسا آدمی بس صرف اپنا کھانا پینا چھوڑ کر بیٹھ رہے''۔

سیرتِ رسول ﷺ سے عملی راہنمائی
پہلا مرحلہ

حماد خالد فیاضی

قارئین کرام! کیا آپ جانتے ہیں کہ مقررین اور خطباء کی محبوب آیت کون سی ہے' سیرت کی مجالس جس کے تذکرے کے بغیر ادھوری رہتی ہیں؟ یہ شرف سورۃ الاحزاب کی آیت ۲۱ کو حاصل ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ......﴾

اس آیت کی تلاوت کے بعد جذبات گرما دینے والی تقریریں ہوتی ہیں' شانِ رسالت کا وہ بیان کہ سننے والے جھوم جھوم اٹھتے ہیں' عشق رسولؐ کے وہ تذکرے کہ آنسو نہیں تھمتے' ہر طرف سبحان اللہ سبحان اللہ کی صدائیں۔ واعظ بھی خوش اور لوگ بھی صدقے واری۔ اس ''ایمان افروز ماحول'' میں خود یہ آیت اپنے حال پر نوحہ کناں رہ جاتی ہے کہ اسے نہ کوئی سنجیدگی سے غور کرنے والا ملا' نہ اس میں موجود پیغام کو سمجھ کر بے چینی محسوس کرنے والا رہا۔ بدقسمتی اور ایسی بدقسمتی کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ......آیت نوکِ زباں پر ہے' نسخہ شفا کا تذکرہ چارسُو ہے' لیکن یاللعجب کہ نسخہ میں تجویز کردہ خوراک نہیں لی جارہی اور نسخہ کے فضائل بیان کیے جارہے ہیں۔ مقامِ حیرت ہے کہ معالج کی ہدایات کے مطابق نسخہ استعمال کرنے کی بجائے سب نسخہ ہی پر سر دھن رہے ہیں—— اور شک اور نفاق کا کینسر اندر ہی اندر ایمان کو چاٹتا چلا جارہا ہے۔

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ کا مطلب ہے کہ ''بے شک تمہارے لیے اللہ کے رسول (کی سیرت) میں بہترین نمونہ ہے۔'' یہ محض کوئی علمی یا نظریاتی قسم کی بات نہیں بلکہ یہ آخری حد تک انتہائی عملی (Practical) بات ہے۔ سچی بات یہ ہے کہ انسان صرف کتابوں میں تحریر کردہ اصولوں پر عمل نہیں کرسکتا' البتہ وہ اپنی پسندیدہ شخصیت کی

پیروی عقیدت و محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر سہولت سے کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دوستوں، رشتہ داروں کی محفل میں اس طرح کے جملے عام طور پر سنتے ہیں:

- عمران خان میرا آئیڈیل ہے۔ مجھے بھی اپنی فیلڈ میں نام کمانے کے ساتھ ساتھ خدمتِ خلق پر توجہ دینی ہے۔
- میں کوکنگ میں کوکب خواجہ کی طرح نام پیدا کرنا چاہتی ہوں۔
- مجھے ڈاکٹر اسرار احمد کی طرح دین کی خدمت کرنی ہے۔
- میرا ابا س معاملات کو جس طرح حل کرتا ہے مجھے بھی وہی طریقے اپنانے ہیں۔

جب یہ بات ہماری فطرت میں شامل ہے کہ ہم رول ماڈل بناتے ہیں اور پھر ان کی طرزِ زندگی گزارنے کی کوشش کرتے ہیں تو ناممکن تھا کہ اللہ تعالیٰ ہماری اس فطری پیاس کی بھرپور تسکین کا سامان مہیاّ نہ فرماتا۔ ﴿لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِىۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ فطرت کی اسی پکار کا جواب ہے۔ اپنی ایک ہی دفعہ کی دستیاب زندگی میں جو کوئی بھی دنیاوی اور اخروی کامیابی کی انتہاؤں کو چھونا چاہتا ہے، وہ فرد ہو یا قوم، اللہ تعالیٰ نے رفعت و بلندی حاصل کرنے کا آسان نسخہ اس کے سامنے رکھ دیا کہ محمد رسول اللہ ﷺ کی زندگی تمہارے سامنے ہے، کوئی گوشہ اس حیاتِ طیبہ کا اندھیرے میں نہیں، باقی ہر ایک سے دامن جھٹک کر اسے اپنا رول ماڈل بنا لو۔ کہیں الگ الگ اصولوں کی طویل فہرستیں نہیں تھمائی گئیں، کوئی پیچیدہ علمی ونفسیاتی بحثیں نہیں کی گئیں، بلکہ ہر ایک کے لیے کامیابی اور فلاح کا سیدھا سیدھا، صاف اور سچا قابلِ عمل نسخہ عطا فرما دیا گیا۔ زندگی میں جو بھی معاملہ ہو، خاندانی ناچاقیاں ہوں، کاروبار یا ملازمت کی پریشانیاں ہوں، اللہ کے احکامات پر عمل کرنے یا اسے پھیلانے میں مسائل کا سامنا ہو، آپ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں، جو قرآن کا جیتا جاگتا نمونہ ہے، تلاش کرو کہ تمہارے اس خاص مسئلے کے حوالے سے کیا راہنمائی موجود ہے؟ شرط تلاش کرنے کی ہے۔ یہ گارنٹی اللہ کی طرف سے ہے کہ تم روشنی کی کرنیں پاؤ گے ضرور! سنتِ رسولؐ کے مطالعے میں اپنے مسائل اور پریشانیوں کا حل پاؤ گے، کہیں بہت واضح، کہیں ذرا چھپا ہوا، لیکن حل ملے گا ضرور!

حضرت محمد ﷺ کی سنّت و سیرت تو اپنی جگہ اُسوۂ حسنہ ہے، سب کے لیے بہترین نمونہ ہے، لیکن کیا واقعی اس سے ہر شخص فائدہ اٹھا سکتا ہے؟ سورۃ الاحزاب کی متذکرہ بالا آیت کا اگلا ٹکڑا اس کا انکار کرتا ہے۔ آیت کے اگلے جزو کے مطابق سنتِ رسولؐ کو ہر شخص اپنے لیے

نمونہ نہیں بنا سکتا۔ کیا آپ کو یہ انوکھی سی بات محسوس ہو رہی ہے؟ سیرتِ رسولؐ سب کے لیے نمونہ ہے‘ لیکن سب اسے نمونہ نہیں بنا سکتے!! یہ ہرگز کوئی عجیب بات نہیں‘ بلکہ ٹھیک یہی اصول تو ہمارے چاروں طرف کام کر رہا ہے۔ بارش کا پانی سب زمینوں کی روئیدگی باہر نکالنے کی صلاحیت رکھتا ہے‘ لیکن سب زمینیں بارش کے پانی سے فائدہ نہیں اٹھاتیں۔ کوئی زمین بنجر اور چٹیل ہو اور پانی کو قبول کرنے ہی سے انکار کر دے تو کیا پانی قصوروار ٹھہرے گا؟ سورج ہر شے کو روشن کر دیتا ہے‘ لیکن کوئی ظلمت پسند شخص اندھیروں میں ہی رہنے پر اصرار کرے تو سورج کو کوئی دوش نہیں دے گا۔ قرآن ھُدًی لِّلنَّاس ہے‘ لیکن اس سے فیضیاب ہونے کی شرط ھُدًی لِلْمُتَّقِیْن ہے۔ سورۃ قٓ میں یہی بات اس طرح واضح کی گئی: ﴿تَبۡصِرَۃً وَّ ذِكۡرٰى لِكُلِّ عَبۡدٍ مُّنِيۡبٍ ۝۸﴾ یعنی رجوع کرنے والے بندے کے لیے یہ قرآن نصیحت اور یاددہانی ہے۔ بالکل اسی طرح نبی مکرمﷺ کی سیرت اپنی جگہ اسوۂ حسنہ ہے‘ آپؐ کی حیاتِ طیبہ سراپا سراجاً منیراً ہے‘ لیکن آپؐ کی سیرتِ پاک کو اپنے لیے نمونہ کون بنائے گا؟ اپنی ذاتی زندگی میں آپؐ کی اطاعت و اتباع کا حوصلہ کون کرے گا؟ اس کی وضاحت آیت کا اگلا ٹکڑا کرتا ہے:

﴿لَقَدۡ كَانَ لَكُمۡ فِىۡ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنۡ كَانَ يَرۡجُوا اللّٰهَ وَالۡيَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيۡرًا ۝۲۱﴾

’’بے شک تمہارے لیے اللہ کے رسول (کی سیرت) میں بہترین نمونہ ہے‘ اُس کے لیے جو اُمید رکھتا ہو اللہ کی اور آخرت کی اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرتا ہو۔‘‘

گویا نبی اکرمﷺ کو اپنے لیے وہی نمونہ بنا سکے گا جس میں یہ تین صفات موجود ہوں۔ وہ اللہ سے امید رکھنے والا ہو‘ اسے آخرت کی فکر دامن گیر ہو اور وہ اللہ کا کثرت سے ذکر کرتا ہو۔ اس آیت کے حاشیے میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں: ’’جو لوگ اللہ سے ملنے اور آخرت کا ثواب حاصل کرنے کی امید رکھتے ہیں اور کثرت سے خدا کو یاد کرتے ہیں اُن کے لیے رسول اللہﷺ کی ذات منبع البرکات بہترین نمونہ ہے‘‘۔

سورۃ الاحزاب کی یہ آیت ایک اہم راز سے پردہ اٹھاتی ہے۔ اگر آپ اپنے اندر جھانکتے ہیں اور من کی دنیا خالی خالی سی محسوس ہو رہی ہے‘ رسول اللہﷺ سے محبت کا جذبہ دھیرے دھیرے مدہم پڑ رہا ہے‘ روز و شب بسر تو ہو رہے ہیں لیکن اطاعتِ رسولؐ میں سُستی سی آ رہی ہے تو یہ آیت ہمیں بتاتی ہے کہ ان کیفیات کے اسباب کیا ہیں۔ چوری چھپے کیا بدپرہیزی

کی جارہی ہے کہ نسخۂ شفا کے اثرات ظاہر نہیں ہو پا رہے۔ رجوع الی اللہ ہاتھ سے چھوٹا جا رہا ہے‘ یا دنیا کی مصروفیات میں آخرت کی فکر گم ہورہی ہے‘ یا اللہ کے ذکر پر بیوی بچوں کی فکر حاوی ہوتی جارہی ہے۔ ﴿یَرۡجُو اللّٰہَ وَالۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا﴾ میں جتنی جتنی کمی اور کوتاہی ہوگی ٹھیک اسی نسبت سے اسوۂ حسنہ کی پیروی زندگی سے خود بخود خارج ہوتی چلی جائے گی۔ یہ cause اور effect کا سیدھا سیدھا تعلق ہے۔

اس آیت میں بیان کردہ تینوں صفات باطن سے متعلق ہیں۔ تینوں روحانی زندگی کو مخاطب کرتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ اصول ہمارے سامنے رکھ دیا کہ حضرت محمدﷺ کی سیرت کو اسی وقت اپنے لیے نمونہ بنا پاؤ گے جب اللہ سے تعلق‘ آخرت کی یاد اور ذکرِ الٰہی سے اپنے باطن کو مضبوط تر کر چکو گے۔ جب روحانی وجود میں اتنی انرجی اور اتنا فیول بھرا ہو کہ مادّی دنیا کی کشش ثقل کا سخت حلقہ توڑ کر بلندیوں کی طرف سفر کر سکو۔ یاد رکھئے! ارضی خواہشات سے متأثرہ بیمار باطن اور آلودہ روح اس عظیم سفر کے لیے اَن فٹ ہے۔

اس پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرنے کے لیے ہی ﴿یَرۡجُوا اللّٰہَ وَالۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا﴾ کا نسخہ عطا کیا گیا ہے۔ یہ تینوں صفات گویا قلبی ایمان کے پاور جنریشن پلانٹ ہیں۔ یہ بندۂ مومن کے خاکی جسم میں موجود روح کو توانا کر دیتی ہیں۔ یہ حقیقی ایمان کی اس کیفیت کو بیدار کر دیتی ہیں جس کی تلاش میں آپ اور میں مدتوں سے پریشان ہیں۔ ہم اکثر ایک دوسرے سے ذکر کرتے ہیں کہ سب کچھ ہے‘ تلاوت ہے‘ دروس ہیں‘ اجتماعات اور ریلیاں ہیں ‘ لیکن قلب میں وہ گداز نہیں‘ من کی دنیا میں وہ حرارت اور سوز نہیں‘ اندر کہیں کچھ خلا کی سی کیفیت ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا یہ کیفیات (effects) ہیں‘ نتائج ہیں۔ ان کے اسباب (causes) خود ہم ہی نے فراہم کیے ہیں۔ مطلوبہ کیفیات پیدا نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ مذکورہ بالا تینوں صفات میں سے کوئی صفت نظر انداز ہو رہی ہے‘ کوئی پاور جنریشن پلانٹ ٹرپ کر چکا ہے۔ کیفیات کی فکر چھوڑیے‘ اسباب دور کرنے کی طرف دھیان دیجیے۔ ایک مرتبہ اس آیت کا سرکٹ مکمل کر دیجیے‘ تن مردہ میں ایمان کا کرنٹ خود بخود دوڑنے لگے گا۔ اگر اس کی فکر نہ کی تو من کی دنیا میں غیر اعلانیہ لوڈ شیڈنگ ہوتی ہی رہے گی۔

اُسوۂ حسنہ کی پیروی کی پہلی شرط ''یَرۡجُو اللّٰہَ'' بتائی گئی‘ یعنی انسان کی تمام اُمیدیں اللہ سے وابستہ ہوں‘ ہر پل اُس کا رجوع اللہ کی طرف ہو۔ بظاہر وہ اسی دنیا میں جی رہا ہو لیکن حقیقتاً

اس کا دل اللہ کے حضور حاضر ہو۔ وہ کھاتا پیتا‘ ہنستا بولتا نظر آ رہا ہو لیکن اس کا کھانا غافل شخص کا سا کھانا نہ ہو۔ منہ میں جانے والا ہر لقمہ اسے اللہ کی نعمتوں کا احساس دلا رہا ہو۔ ٹھنڈا پانی پینا اس کے لیے بیسیوں مرتبہ دہرائے جانے والا روزِ مرہ کا ایک معمول نہ ہو بلکہ اس میں مسلسل شکر کی کیفیت پیدا کرتا جا رہا ہو۔ کسی کے بارے میں زبان سے نکلنے والے غیبت کے جملے پر وہ بے فکر نہ بیٹھا رہے بلکہ فوراً اپنے اس عمل سے اس میں کراہت کی کیفیت پیدا ہو۔ بیوی بچوں کے ساتھ ہنستے کھیلتے دل ہی دل میں ﴿رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا﴿۷۴﴾﴾(الفرقان) کا وظیفہ جاری ہو۔ اس کا ہر معاملہ‘ ہر عمل اس کے لیے روحانی غذا بن رہا ہو‘ اسے اللہ سے قریب تر کر رہا ہو۔ چاہے تو اسے روحانیت کہہ لیں یا طریقت کا عنوان دیں‘ لیکن اللہ کی طرف رجوع کا یہ اتنا فطری اور اتنا سادہ طریقہ ہے کہ اس میں نہ قلب جاری کرنے کی ریاضتیں ہیں‘ نہ کسی شیخ و پیر کی محتاجی ہے‘ نہ ضربیں ہیں اور نہ نفس کشی کی مصنوعی کوششیں۔ محض ایک حساس دل چاہیے اور اس کے ساتھ شعوری کوشش کی ضرورت ہے۔

رجوع الی اللہ کی یہ کیفیت اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب انسان کا دل اتنا حساس اور اتنا sensitive ہو کہ ایمان کی ذرا سی کمی بیشی نگاہوں سے اوجھل نہ رہ سکے۔ قلب کی سکیورٹی اس بلا کی ہو کہ اس تعلق باللہ پر نقب لگانے والا ہر خیال اور ہر عمل وقوعہ سے پہلے گرفتار کر لیا جائے۔ دل میں سنار کا سا پیمانہ نصب ہو کہ ایمان کی رتی بھر کمی تک شناخت کر ڈالے اور اللہ سے تعلق ٹوٹتا محسوس ہوتے ہی انسان ربِّ کریم کے آگے سجدہ ریز ہو جائے۔ کبھی ﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ﴿۲۳﴾﴾(الاعراف) کے الہامی کلمات میں پناہ ڈھونڈے تو کبھی ﴿اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ﴿۱۰﴾﴾(القمر) کی صدائیں دل سے بلند ہوتی ہوں۔

یہی وہ وصف ہے جو سورۃ الاعراف میں اللہ سے صحیح معنوں میں ڈرنے والوں کے لیے بیان ہوا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ﴿۲۰۱﴾﴾

”جو لوگ متقی ہیں ان کا حال تو یہ ہوتا ہے کہ کبھی شیطان کے اثر سے کوئی بُرا خیال انہیں چھو بھی جاتا ہے تو وہ فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں‘ پھر یکایک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔“

اللہ کا ڈر آدمی کو بے حد حساس بنا دیتا ہے۔ مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں ''برے خیال کا ایک ذرا سا غبار بھی اگر ان کے دل کو چھو جاتا ہے تو انہیں ویسی ہی کھٹک محسوس ہونے لگتی ہے جیسی انگلی میں پھانس چبھ جانے سے یا آنکھ میں کسی ذرّے کے گر جانے سے محسوس ہوتی ہے۔''

قلم میں تاب کہاں یہ بیان کرنے کی کہ خود حضرت محمدﷺ کی رجوع الی اللہ کی کیفیت کیا تھی؟ آپﷺ کا اپنے ربّ سے تعلق کس درجے کا تھا' اس کا گمان تک ناممکن ہے اور عاجزی کا احساس بھی عاجز۔ یہ ہم انسانوں کے بس کی بات ہی نہیں۔ البتہ ذرا سا پردہ اٹھا کر اس تعلق کی ہلکی سی جھلک خود آنحضورﷺ ہی نے دکھلائی ہے۔ جب آپﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو صومِ وصال سے منع کیا تو ساتھ ہی ارشاد فرمایا:

((اِنِّی لَسْتُ مِثْلُکُمْ ' اِنِّی اَظَلُّ یُطْعِمُنِی رَبِّی وَیَسْقِیْنِی))(۱)

''میں تمہاری طرح نہیں ہوں' مجھے تو میرا رب کھلاتا اور پلاتا رہتا ہے۔''

ذرا ذہن میں رکھیے یہ مقام' جہاں تمام بلندیاں آنحضورﷺ کے آگے سجدہ ریز ہیں' اور پھر توجہ کیجیے نبی مکرمﷺ کے اس قول پر۔ آپؐ فرماتے ہیں: ((فَاِنِّی اَتُوْبُ فِی الْیَوْمِ اِلَـیْہِ مِائَۃَ مَرَّۃٍ))(۲) ''بے شک میں ایک دن میں سو سو مرتبہ اللہ کی جناب میں توبہ کرتا ہوں۔'' ایک طرف اللہ سے تقربّ کی وہ انتہا کہ جہاں فرشتوں کے پر جل اٹھیں اور دوسری طرف قلب پر اتنی گہری نظر کہ دن میں سوٗ سو مرتبہ استغفار!! کیا اُمتیوں کو اپنے حال پر نظر کر کے تڑپ نہیں اٹھنا چاہیے؟ خواہشاتِ نفس کے تعاقب میں نڈھال' آپ اور میں' دن میں کتنی مرتبہ استغفار کرتے ہیں؟

اللہ کے رسولﷺ کے روز و شب کا نقشہ ذہن میں تازہ کیجیے۔ بازاروں میں گشت کر کے دین کی دعوت دے رہے ہیں' میلوں میں جا کر ایمان کی صدا لگا رہے ہیں' راہِ حق میں مشقتیں جھیل رہے ہیں۔ اِک آگ دل میں لگی ہے جو بیٹھنے نہیں دیتی۔ اپنے جسم میں موجود توانائی کی آخری بوند تک مالک کے راستے میں نچوڑ دینے کے بعد کیا رات کو بستر پر دن بھر کی تھکن اتارتے دکھائی دیتے ہیں؟ نہیں! بلکہ آدھی رات کو تنہائی میں اپنے رب کے حضور

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب التمنی' ما یجوز من اللو۔ وصحیح مسلم' کتاب الصیام' باب النھی عن الوصال فی الصوم۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار' باب استحباب الاستغفار والاستکثار منہ۔

کھڑے ہیں‘ آہ وزاریاں ہیں‘ رکوع وسجود ہیں۔ انسانی حد تک ممکن یہ تمام تر کوششیں کر ڈالنے کے بعد اس حساس ترین قلبِ مبارک کی مناجات سنیے: ‘‘

((اَللّٰھُمَّ رَحْمَتَکَ اَرْجُوْ فَلَا تَکِلْنِیْ اِلٰی نَفْسِیْ طَرْفَۃَ عَیْنٍ))(۳)

’’اے اللہ! مجھے تیری رحمت کی اُمید ہے‘ پس مجھے لحہ بھر بھی اپنے نفس کے حوالے نہ فرما۔‘‘

((اَللّٰھُمَّ مَغْفِرَتُکَ اَوْسَعُ مِنْ ذُنُوْبِیْ وَرَحْمَتُکَ اَرْجٰی عِنْدِیْ مِنْ عَمَلِیْ))(٤)

’’اے اللہ! تیری مغفرت میرے گناہوں سے بہت وسیع ہے‘ اور مجھے تیری رحمت کا آسرا ہے نہ کہ اپنے عمل کا۔‘‘

((اَللّٰھُمَّ لَا تَجْعَلْنِیْ بِدُعَائِکَ شَقِیًّا وَکُنْ لِیْ رَءُ وْفًا رَحِیْمًا))(٥)

’’اے اللہ! تو ایسا نہ کر کہ تجھ سے مانگوں پھر بھی محروم رہوں۔ تو میرے حق میں بڑا مہربان نہایت رحم کرنے والا بن جا۔‘‘

اس کے مقابلے میں اپنے حال پر نظر کیجیے۔ ہمارا دل گینڈے کی کھال سے بھی زیادہ سخت اور کھردرا ہو چکا ہے۔ وہ حساسیت جو حقیقی ایمان کی جان ہے اس کا دُور دُور تک نام و نشان نہیں۔ منہ اندھیرے سے شام گئے تک دنیا کے دھندوں میں مصروف‘ دن بھر سچ میں کتنے ہی جھوٹ ملاتے رہے‘ ڈھکے چھپے کتنے ہی غلط کام کرتے رہے‘ کتنے ہی گناہ سرزد ہوتے رہے —— اور نہ کوئی چبھن‘ نہ کوئی خلش‘ نہ اللہ سے ٹوٹتے تعلق کا کوئی غم‘ نہ استغفار کا خیال۔ کوئی بے فکری سی بے فکری ہے!!

ہر پل اللہ سے رجوع کی کیفیت اور دل کی حساسیت کے بغیر سیرت کی پیروی ناممکن ہے۔ سیرت پر کتابیں پڑھی جاسکتی ہیں‘ حیاتِ طیبہ کی معلومات جمع کی جاسکتی ہیں‘ میلاد کی محفلیں سجائی جاسکتی ہیں‘ جھنڈے لے کر جلوسوں میں شرکت کی جاسکتی ہے۔ غرض سیرت کے نام پر ہر کام ہوسکتا ہے‘ لیکن سیرت کو اپنی ذاتی زندگی کے لیے اُس وقت تک نمونہ نہیں بنایا جاسکتا جب تک دل زندہ نہ ہو‘ اللہ سے رجوع نہ ہو۔

---

(۳) سنن ابی داوٗد‘ کتاب الادب‘ باب ما یقول اذا اصبح۔

(٤) مستدرك حاكم‘ عن جابر بن عبد اللّٰہ رضی اللہ عنہ۔

(٥) کنز العمال ومعجم الطبرانی‘ عن ابن عباس رضی اللہ عنہ۔

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے!

متذکرہ بالا آیت میں سیرت کی پیروی کی دوسری شرط آخرت کی فکر بیان کی گئی ہے۔ یہ آخرت کی جوابدہی کا زندہ احساس ہے جو انسان کو تیر کی طرح سیدھا رکھتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ انسان آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور پھر اس میں لاابالی پن' بے فکری' کھلنڈراپن' غفلت جیسی خصوصیات موجود ہوں۔ آخرت کو ماننا کوئی ہنسی مذاق نہیں بلکہ یہ ایک دل دہلا دینے والی حقیقت کو تسلیم کرنا ہے۔ ایسی حقیقت جو انسان کے اندر گہری سنجیدگی پیدا کر دیتی ہے اور انسان کی اَقدار (values) اور طرزِ زندگی کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ یہ انسان کی ترجیحات کو ۳۶۰ درجے کے زاویے پر گھما دیتی ہے۔ پہلے اگر پیسہ جمع کرنا محبوب تھا تو اب مال و دولت اللہ کی راہ میں لٹانا مقصود' پہلے جان عزیز تھی اب سر کٹانا عزیز تر' پہلے سستے پلاٹوں کی تلاش میں رہنے والے اب جنت میں گھر کے لیے تڑپ رہے ہیں' پہلے بیوی بچے سب کچھ تھے اب اللہ اور اس کے رسول پر ہر شے نثار۔ آخرت کی فکر دلوں کو نرم کر دینے والی شے ہے اور موت کو یاد کرنا لذتوں کو ڈھا دینے والا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے دلوں کا زنگ دور کرنے کا یہی نسخہ بتایا ہے: ((كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ))(٦) یعنی دلوں کا زنگ دور کرنے کے لیے موت کو کثرت سے یاد کیا کرو' اور قرآن کی تلاوت کیا کرو! قرآن کے ہر صفحے پر آخرت کا ذکر ہے' قیامت کا منظر ہے' جنت و جہنم کی تصویر کشی ہے۔ جس کے دل میں الفاظِ قرآنی ﴿فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝﴾ (الزلزال) کندہ ہو گئے وہ کبھی صراطِ مستقیم سے بھٹک نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کا احساس انسان کو نفسانی تقاضوں اور حیوانی درجوں سے اوپر اٹھاتا ہے۔ آخرت ﴿لَعِبٌ وَّ لَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ﴾ (الحدید: ۲۰) کے پُر فریب جال کا توڑ ہے۔

کفار نے ''شق القمر'' کا معجزہ اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھا' لیکن اس کے باوجود ایمان نہیں لائے کہ آخرت سے بے پروا تھے۔ اسی طرح جو انسان آخرت سے بے فکر ہوگا اللہ کی نشانیاں اس کے چاروں طرف موجود ہوں گی اور وہ ٹھیک ان نشانیوں کے درمیان جینے کے

(٦) رواه البيهقي في شعب الايمان۔

باوجود ان سے کوئی سبق حاصل کرنے سے محروم رہے گا۔ ایمان کو جلا بخشنے والے واقعات اس کے اردگرد واقع ہو رہے ہوں گے، لیکن اہل مکہ کی طرح اس شخص کو کوئی پروا نہیں ہوگی اور وہ سوچے سمجھے بغیر ان سے گزرتا چلا جائے گا۔ آنحضورﷺ چلتے پھرتے آتے جاتے انہی نشانیوں کے ذریعے سے دلوں میں آخرت کی یاد روشن فرماتے تھے۔ کبھی راستے میں مُردہ بکری کے بچے پر گزر رہوا تو آپؐ نے پوچھا: ((اَيُّكُمْ يُحِبُّ اَنَّ هٰذَا لَهٗ بِدِرْهَمٍ؟)) ''تم میں سے کون اس کو ایک درہم میں خریدنا پسند کرے گا؟'' صحابہ کے انکار پر آپؐ نے فرمایا: ((فَوَ اللّٰهِ لَلدُّنْيَا اَهْوَنُ عَلَى اللّٰهِ مِنْ هٰذَا عَلَيْكُم))(۷) ''اللہ کی قسم! اللہ کے نزدیک دنیا اس مردار بچے سے بھی زیادہ ذلیل اور بے قیمت ہے۔'' آخرت کی فکر نے راستے میں پڑے مردار تک کو نشانی بنا دیا۔ کیا راہ چلتے آپ کو کبھی کوئی نشانی نظر آئی؟ ع ''جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!''

رسول اللہﷺ پر اس درجہ خشیتِ الٰہی کا غلبہ تھا کہ ذرا ہوا تیز چلتی تو آپؐ گھبرا جاتے۔ حضرت عائشہ ؓ کے الفاظ ہیں: وَاِذَا تَخَيَّلَتِ السَّمَاءُ تَغَيَّرَ لَوْنُهٗ جب آسمان پر ابر آتا تو آپؐ کے چہرے کا رنگ بدل جاتا۔ اس طرح مضطرب ہوتے کہ حضرت عائشہؓ وہ کیفیت بیان فرماتی ہیں: وَخَرَجَ وَدَخَلَ کبھی باہر آتے، کبھی اندر جاتے۔ وَاَقْبَلَ وَاَدْبَرَ کبھی آگے بڑھتے، کبھی پیچھے ہٹ جاتے۔ ایک بے کلی، بے چینی طاری رہتی۔ حضرت عائشہؓ کے استفسار پر آپﷺ نے جواب دیا:

((لَعَلَّهٗ يَا عَائِشَةُ كَمَا قَالَ قَوْمُ عَادٍ ﴿فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا﴾))(۸)

''عائشہ! شاید یہ ابر اس طرح کا ہو جو قومِ عاد کی طرف بھیجا گیا تھا۔ جب ان لوگوں نے بادلوں کو اپنی وادیوں کی طرف بڑھتے دیکھا تو خوش ہوتے ہوئے کہا کہ یہ ابر ہمارے لیے بارش لانے والا ہے۔''

ہوا کا چلنا اور بادلوں کا گھر آنا ایک عام موسمی کیفیت ہے۔ دل اگر زندہ ہے تو یہی انسان میں اللہ کی پکڑ کا خوف اور آخرت کی تڑپ پیدا کر دینے کا سبب بن جاتا ہے، اور دل اگر غافل ہے تو موسم کی اسی تبدیلی میں انسان پکنک منانے اور موسم سے لطف اندوز ہونے نکل کھڑا ہوتا ہے۔

(۷) صحیح مسلم، کتاب الزھد والرقائق۔

(۸) صحیح البخاری، کتاب تفسیر القرآن، باب قولہ فلما راوہ عارضا مستقبل اودیتھم......۔ وصحیح مسلم، کتاب صلاۃ الاستسقاء، باب التعوذ عند رؤیۃ الریح والغیم...... واللفظ لہ۔

اصولاً تو اس ابدی خسارے سے بچنا ہمارا اہم ترین مسئلہ ہونا چاہیے۔ اتنا اہم کہ تمام زمینی چھوٹے چھوٹے مسائل اس میں گم ہو چکے ہوں۔ لیکن حقیقتاً اگر آپ اپنے مسائل کی فہرست بنائیں تو آپ خود حیران رہ جائیں گے کہ اس پوری لسٹ میں آخرت کا کہیں اندراج ہی نہ ملے گا۔ سچی مگر کڑوی بات یہ ہے کہ ہم باہر اپنی گلی میں بند سیوریج اور ابلتے گٹر کے مسئلے تک کو آخرت کے مقابلے میں زیادہ شدت سے محسوس کرتے ہیں' جبھی تو آخرت سے زیادہ اس کے لیے پریشان اور بھاگے دوڑے پھرتے ہیں۔ سورۃ الاحزاب کی یہ آیت ہمیں آگاہ کر رہی ہے کہ نبیﷺ کے اُسوہ کی پیروی ممکن ہی نہیں جب تک آخرت کی فکر اور جوابدہی کا احساس دل میں موجزن نہ ہو۔

اُسوۂ حسنہ کی پیروی کی تیسری شرط اللہ کا کثرت سے ذکر ہے۔ ہر دم اللہ کی طرف رجوع اور ہر پل آخرت کی فکر جو باطنی انقلاب پیدا کرتے ہیں ذکر اسی کی قولی اور عملی شکل ہے۔ گویا ﴿یَرۡجُو اللّٰہَ وَالۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ﴾ کا نتیجہ ﴿ذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا﴾ کی صورت میں ہی ظاہر ہوگا۔ نوٹ کیجیے کہ بات محض اللہ کے ذکر تک محدود نہیں بلکہ اس کے ساتھ ''کثیر'' کا لفظ احساس دلا رہا ہے کہ اسوۂ محمدیؐ پر عمل کے لیے کس درجے کی روحانیت درکار ہے۔ یہ کس شدت سے اللہ سے چمٹے رہنے کا تقاضا کرتا ہے۔ کثرت کا مفہوم ایک حدیث سے واضح ہوتا ہے۔ رسول اکرمﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ کو اتنی کثرت سے یاد کرو کہ لوگ تمہیں دیوانہ اور مجنون سمجھنے لگیں۔ اگر آپ نے یہ حدیث محض برکت کی نیت سے پڑھ لی ہے تو برائے مہربانی اسے دو بار' پانچ بار' دس بیس بار تکرار سے پڑھیں جب تک آپ اس قولِ رسولؐ میں موجود پیغام تک نہ پہنچ جائیں۔ یہ حدیث پڑھ کر اگر آپ کے ذہن میں یہ خیال سر اُبھار رہا ہے کہ کیا میں دیوانوں کی طرح ہر وقت اللہ اللہ کرتا رہوں اور دنیا کے سارے کام دھندے چھوڑ دوں؟ تو آپ کی یہ سوچ اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ آپ کی نظر حدیث کے الفاظ تک ہی رہی' الفاظ کے پیچھے موجود عظیم حقیقت سے آپ ناآشنا ہیں۔ ''اللہ کو اتنی کثرت سے یاد کرو کہ لوگ تمہیں دیوانہ اور مجنون سمجھنے لگیں'' یہ حدیث ہمیں سمجھاتی ہے کہ جو شے حقیقی طور پر دل میں بسی ہو ممکن نہیں کہ ہر وقت زبان پر اسی کے تذکرے نہ ہوں۔ پیسہ کے پجاری کی زبان پر دیوانگی کی حد تک کس کا ذکر ہوتا ہے؟ کبھی آپ کسی ایسے نوجوان سے ملے ہیں جسے جنون کی حد تک کرکٹ کا شوق ہو؟ وہ جب بھی آپ سے گفتگو کرے گا تو اس کا موضوع کیا ہوگا؟ اولاد کی محبت میں حد سے زیادہ

گرفتار شخص ہر وقت آپ کو کس کی باتیں سنا سنا کے بور کرتا رہے گا؟ دراصل اس حدیث میں حضورﷺ نے ہمیں اپنے باطن کو پرکھنے کا ایک پیمانہ عطا فرما دیا ہے۔ جس کے زبان پر تذکرے ہیں اصل میں وہی شے دل میں بسی ہے۔ اگر حقیقتاً اللہ دل میں بسا ہے تو کیا زبان پر دیوانگی کی حد تک اس کا ذکر نہیں ہونا چاہیے؟ اللہ کا کثرت سے ذکر کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ آج سے سو دانوں کی تسبیح رکھ کے' آستینیں چڑھا کے' لاکھ دانوں والی تسبیح تھام لیں۔ اگر اللہ سے تعلق اور آخرت کی فکر نے دل میں صحیح طور سے جڑ پکڑ لی ہے تو صبح آنکھ کھلنے سے رات گئے آنکھ بند کرنے تک ہر بات ذکر ہو گی' ہر کام ذکر قرار پائے گا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرمﷺ نے فرمایا: ''وہ شخص جو اپنے رب کا ذکر کرتا ہے اور وہ جو نہیں کرتا دونوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک زندہ اور دوسرا مُردہ۔'' (بخاری و مسلم) چند الفاظ میں معانی کا ایک جہاں آباد ہے۔ دین کی حقیقت آپؐ نے اس طرح کھول کر بیان کر دی کہ یہ ایک جملہ ہی کئی کتابوں پر بھاری ہے' اور اَلفاظ کا چناؤ ایسا کہ ایک اَن پڑھ دیہاتی سے لے کر حکمران تک کوئی بھی ہدایت سے محروم نہ رہ پائے۔ نبی اکرمﷺ نے اس حدیث میں زندگی اور موت کا انوکھا تصور دیا ہے۔ گویا اسلام میں زندگی اور موت کا تصور (concept) باقی سب سے جُدا ہے۔ زندگی محض سانس لینے' کھانے پینے' ملازمت' شادی وغیرہ کا نام نہیں۔ یہ تو حیوانی درجہ کی زندگی ہے۔ انسان جیسی تخلیق کے لیے درجۂ حیوانات پر زندگی گزارنا اور پھر اس پر راضی رہنا تو گویا موت کے برابر ہے۔ نبی اکرمﷺ کے نزدیک حقیقی زندگی اسی کو حاصل ہے جس کا دل اللہ کی یاد سے معمور ہو' رب کی یاد کے بغیر زندگی ناممکن محسوس ہوتی ہو۔ ﴿اَلَّذِیْنَ یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِھِمْ﴾ (آل عمران: ۱۹۱) محض قال نہیں حال بن چکا ہو۔ اٹھتے' بیٹھتے' لیٹتے اُسی کی یاد' اُسی کا ذکر ہو۔

ذکر کے بارے میں لکھنا اور پڑھنا جتنا سہل ہے عملاً معاملہ اتنا آسان نہیں۔ کثرتِ ذکر تو اگلی منزلیں ہیں۔ ابھی صرف نماز ہی کے معاملے کو لیجیے۔ نماز سراپا ذکر ہے اور ذکر کی جامع ترین صورت ہے کہ الفاظ قرآنی ہیں اور طریقہ محمدیؐ ہے۔ نماز اللہ سے ہم کلامی ہے۔ اسی لیے تو مؤمن کی معراج ہے۔ تاثیر میں اس سے بڑھ کر ذکر کا کوئی طریقہ ممکن نہیں۔ ذکر کے اس الہامی طریقے سے آپ کی وابستگی کتنی ہے؟ کیا واقعتاً دل ہر وقت مسجد میں اٹکا رہتا ہے؟ حَیَّ عَلَی الْفَلَاحِ کی پکار سن کر تڑپ اٹھتے ہیں؟ سکون نہیں ملتا جب تک حاضر ہو کر سجدے میں سر نہ

رکھ دیں؟ ﴿فَاسۡعَوۡا اِلٰی ذِکۡرِ اللّٰہِ﴾ کی سی کیفیت ہوتی ہے یا گھر میں‘ دفتر میں بیٹھے گھڑی تکتے رہتے ہیں کہ ابھی دس منٹ باقی ہیں‘ ابھی دو منٹ باقی ہیں۔ کہتے ہوئے دل کانپ جاتا ہے لیکن قرآن ٹھیک یہی نقشہ منافقین کی نماز کا کھینچتا ہے: ﴿وَاِذَا قَامُوۡۤا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوۡا کُسَالٰی﴾ (النساء:۱۴۲) ”جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو بڑی کسل مندی کے ساتھ“۔ اُن کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں خدا کے ذکر سے کوئی رغبت نہیں‘ صرف اپنے آپ کو مسلمانوں میں شمار کرانے کی مجبوری تھی۔ سچے مؤمنوں کے سے ذوق وشوق سے یہ محروم تھے۔

اپنے اندر جھانک کر ذرا جائزہ لیجیے کہ دو رکعت نماز آپ کتنی دیر میں ادا کرتے ہیں؟ دو منٹ میں‘ چار منٹ میں‘ دس منٹ میں؟ اپنی زندگی میں جس شدت سے آپ اللہ کی ضرورت محسوس کرتے ہوں گے اسی تناسب سے آپ کی نماز کا دورانیہ بڑھتا جائے گا۔ بیٹا اگر آپریشن تھیٹر میں ہو تو کبھی نماز دو منٹ میں ختم نہیں ہوگی۔ ہاں اگر تمام معاملات نارمل ہیں اور کوئی ایمرجنسی نہیں تو آپ اللہ سے چمٹنے کی زیادہ ضرورت محسوس نہیں کریں گے اور سلام پھیرنے میں جلدی کریں گے۔ کیا واقعی عام زندگی میں مجھے اور آپ کو اللہ کی ضرورت نہیں؟

سورۃ الاحزاب کی آیت ۲۱ دوبارہ ملاحظہ فرمائیے:

﴿لَقَدۡ کَانَ لَکُمۡ فِیۡ رَسُوۡلِ اللّٰہِ اُسۡوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنۡ کَانَ یَرۡجُوا اللّٰہَ وَالۡیَوۡمَ الۡاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیۡرًا ﴿۲۱﴾﴾

”بے شک تمہارے لیے رسول اللہ (کی سیرت) میں بہترین نمونہ ہے‘ اس کے لیے جو امید رکھتا ہے اللہ سے (ملاقات کی) اور یوم آخرت کی اور اللہ کا کثرت سے ذکر کرتا ہے۔“

خلاصۂ بحث یہ ہے کہ اللہ کی طرف رجوع‘ آخرت کی فکر اور اللہ کا کثرت سے ذکر انسان کے اندر ایسی روحانی طاقت بھر دیتے ہیں کہ اب انسان خود بخود نبی مکرمﷺ کے اُسوۂ حسنہ کی پیروی کے لیے بے تاب ہوگا‘ بالکل اسی طرح جیسے پیاسا پانی سامنے دیکھ کر تڑپ اٹھتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک صفت کی کمی بھی دل کی غفلت کا سبب بن جائے گی۔ نتیجتاً سیرتِ رسولؐ سے دُوری بڑھتی چلی جائے گی۔

سائنس میں طریقۂ تعلیم یہ ہوتا ہے کہ پہلے طلبہ کو تھیوری پڑھائی جاتی ہے‘ پھر مزید تفہیم کے لیے پریکٹیکلز کرائے جاتے ہیں۔ سورۃ الاحزاب کی آیت ۲۱ کی تھیوری کا تو ہم نے مطالعہ

کرلیا‘ اس کے معانی و مفہوم کو خوب اچھی طرح سمجھ لیا‘ آیئے اب اس کا پریکٹیکل کرتے ہیں۔ سورۃ الاحزاب میں تو کُل اُسوۂ حسنہ کی بات ہے‘ پریکٹیکل کی غرض سے ابھی ہم پوری سیرتِ رسولؐ میں سے صرف ایک پہلو ’’عہد کی پاسداری‘‘ کو لیتے ہیں۔ ایفائے عہد پر نصوصِ قرآنی ہم سب کے علم میں ہیں:

﴿وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ﴾ (البقرۃ : ۱۷۷)

’’اور پورا کرنے والے عہد کے جب عہد کرلیں۔‘‘

﴿وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝۸﴾ (المومنون)

’’اور وہ جو اپنی امانتوں اور عہد کو پورا کرتے ہیں۔‘‘

﴿وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا ۝۳۴﴾ (بنی اسرائیل)

’’اور اپنے عہد پورے کرو‘ بے شک عہد کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔‘‘

ان قرآنی آیات کی عملی تفسیر سیرتِ محمدیؐ میں دیکھئے تو کیا نقشہ نظر آتا ہے؟ اشارۃً عرض ہے کہ حضرت ابو جندل رضی اللہ عنہ کی واپسی کا کڑا وقت یاد کیجیے‘ یا تین دن تک اپنے عہد سے بندھے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کو بازار میں ایک شخص کا انتظار کرتے دیکھئے‘ یا حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ کا ابوجہل سے جنگ میں حصہ نہ لینے کا وعدہ کرنا اور اسی کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا انہیں غزوۂ بدر میں شرکت سے منع فرما دینا‘ ذہن میں لایئے۔ قرآنی آیات اور سیرت سے یہ بات واضح ہوگئی کہ ہم پر وعدہ کی پابندی لازم ہے۔ اب پریکٹیکل کا آغاز کرتے ہیں۔ سورۃ الاحزاب کی آیت ۲۱ کے مطابق اللہ سے امید‘ آخرت کی فکر اور ذکر کی کثرت کی صفات سے اگر باطن منور ہے تو انسان عہد کی پاسداری کے حوالے سے مسلسل فکرمند رہے گا کہ کہیں کوئی ایسا وعدہ نہ ہو جو پورا نہ کرسکوں۔ کہیں کوئی عہد ٹوٹ تو نہیں رہا؟ وہ ہر لمحہ عہد کی پاسداری کے حوالے سے اپنے آپ کو بہتر کرتا رہے گا‘ یہاں تک کہ اس کی شخصیت کا یہ پہلو ارد گرد رہنے والوں کو بھی متأثر کرنا شروع کردے گا۔ لوگوں میں اس کی شخصیت ممتاز ہوتی چلی جائے گی‘ اس کی ساکھ اور اس پر اعتماد قائم ہوتا چلا جائے گا۔ آہستہ آہستہ ایفائے عہد کے حوالے سے معاشرے میں وہ ایک مثال بن جائے گا۔ نوٹ کیجیے کہ یہ سب اسی وقت ممکن ہوگا جب دل پر یہ آیت ﴿اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلًا﴾ نقش ہوگی اور سیرتِ محمدیؐ میں عہد کی پاسداری کا نمونہ ہر وقت ہمارے سامنے ہوگا۔

اب پریکٹیکل کا اگلا مرحلہ شروع ہوتا ہے۔ اگر اللہ کی طرف رجوع کی کیفیت ع ’’نہیں

آتی تو یادانہیں کی مہینوں تک نہیں آتی!'' جیسی ہے' آخرت کی فکر ہر ہر لمحہ لاحق نہیں بلکہ سال میں کہیں ایک دو بار فکر ہوئی تو چند آنسو بہا کر مطمئن ہو گئے' ذکر کا معاملہ کچھ اس طرح کا ہو کر رہ گیا ہے کہ ؎

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے!

تو اس باطنی کیفیت کے ساتھ اب عملی زندگی میں عہد کی پاسداری کی کیا شکل ہوگی؟ اس کی چند صورتیں پیش خدمت ہیں:

۱) دیکھا کہ وزن بڑھتا جا رہا ہے۔ اپنے آپ سے عہد کیا کہ کل سے لازماً صبح نماز کے بعد ورزش کرنی ہے۔ جذبات کا زور ذرا اور بڑھا تو نئے جاگرز اور ٹریک سوٹ بھی خرید لائے۔ دو دن بعد ہی ساری گرمی اتر گئی۔ خود سے کیا ہوا عہد توڑنا بڑا نازک معاملہ ہے۔ اس طرح آہستہ آہستہ انسان اپنی قوتِ ارادی (will power) سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دینی و دنیاوی ہر محاذ پر انسان بڑے آرام سے نفس کے ہاتھوں شکست پر شکست کھاتا چلا جاتا ہے۔

۲) بچوں کی فرمائش پوری کرنے کا وعدہ کیا۔ مصروفیات میں بھول گئے۔ اسباب جو بھی ہوں' بچوں کے سامنے وعدہ کر کے توڑنے کا عملی مظاہرہ کر دکھایا۔

۳) رومانی جذبات ذرا زیادہ سر چڑھے تو بڑے چاؤ سے بیوی کو باہر کھانا کھلانے کا وعدہ کیا۔ اگلے دن بچاری نے یاد دلایا تو بپھر گئے۔

۴) کسی دوست' رشتہ دار سے گھر آنے کا وعدہ کیا۔ نہیں گئے۔ فون پر معذرت تک نہ کی۔ بعد میں ملے تو کوئی بہانہ کر دیا۔

۵) اپنے ملازموں کو طے شدہ وقت پر تنخواہ نہ دی۔ کسی نے مطالبہ کیا تو اسے جھڑک دیا۔

۶) اپنے باس سے مقررہ وقت پر اسائنمنٹ مکمل کر کے دینے کا وعدہ کیا۔ وقتِ مقررہ پر کام مکمل نہ ہونے کی ۱۰۰۱ جھوٹی سچی وجوہات کی لسٹ بیان کر دی۔

۷) پہلے کلمۂ شہادت پڑھا۔ اس پر مزید اللہ سے عہد کیا ''اِنِّیۡ اُعَاھِدُ اللّٰہَ......'' پھر اس پر مزید بیعت بھی کر لی۔ پہاڑ ہلا دینے والے یہ عہد کر لینے کے بعد پھر پہلے کی طرح مزے سے زندگی گزارنے لگے۔

۸) نقیب سے عہد کیا اور پھر اس کی پروا بھی نہ کی۔ اس کے یاد دلانے پر خوش مزاجی کا ثبوت دیتے ہوئے گنگنانے لگے ع ''وہ وعدہ ہی کیا جو وفا ہو گیا!''

دوبارہ ذہن میں تازہ کیجیے کہ یہ مکمل سیرت کے حوالے سے جائزہ نہیں بلکہ اس کے محض ایک پہلو ''ایفائے عہد'' کے حوالے سے اپنا تجزیہ تھا۔ ذرا دل پر ہاتھ رکھ کے بتائیں کہ اس آئینے میں اپنا کہیں عکس نظر آتا ہے؟ کہیں دھندلا، کہیں واضح؟ یہ حالات بتا رہے ہیں کہ زندگی میں تعلق باللہ، آخرت اور ذکر سے غفلت ہو رہی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ قلبی اور حقیقی ایمان پیدا نہیں ہو رہا۔ ایمان کی کمی کی وجہ سے سیرتِ رسول کو اپنی ذاتی زندگی کے لیے عملی نمونہ بنانے کی اُمنگ بجھتی جا رہی ہے۔

کیا ہمارے روز و شب اسی ڈھلمل ایمان کیساتھ بسر ہوتے رہیں گے؟ کیا وقت اسی طرح گزرتا جائے گا؟ کیا کردار کے اس بودے پن کے ساتھ ہم دنیا میں نظامِ خلافت قائم کرنے چلے ہیں؟ دو ہفتے میں ایک اسرہ میٹنگ میں شرکت اور پھر اگلے چودہ دن کے لیے فارغ! اگر اقامت دین کے مجاہد سے محض اتنا ہی مطالبہ ہوتا تو شاید آخرت میں محاسبہ کے وقت کام نہ کرنے کا کوئی جھوٹا سچا جواز مل جاتا۔ لیکن ادھر قرآن برابر صدا دے رہا ہے:

﴿اَرَضِیۡتُمۡ بِالۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا مِنَ الۡاٰخِرَۃِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا فِی الۡاٰخِرَۃِ اِلَّا قَلِیۡلٌ ﴿۳۸﴾﴾ (التوبۃ)

''کیا تم نے آخرت کے بدلے دنیا کی زندگی پسند کر لی ہے؟ پس (اگر یہ بات ہے تو یہ تمہاری سخت غلط فہمی ہے، کیونکہ) دنیوی زندگی کا سروسامان آخرت کے مقابلے میں بہت ہی قلیل ہے!''

❁❁❁

عن ابی هریرة رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم انه قال:

((مَنْ نَسِیَ وَھُوَ صَائِمٌ فَاَکَلَ اَوْ شَرِبَ فَلْیُتِمَّ صَوْمَهٗ، فَاِنَّمَا اَطْعَمَهُ اللّٰهُ وَسَقَاهُ)) (متفق علیه)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''روزہ دار بھول کر کچھ کھا پی لے تو (اس کا روزہ ٹوٹا نہیں) وہ اس کو پورا کرے، کیونکہ دراصل یہ اسے اللہ نے کھلایا اور پلایا ہے''۔

??

قرآن مجید کا تصورِ امن وسلامتی

حافظ محمد مشتاق ربانی

امن اس حالت کا نام ہے جس میں طلبِ خیر اور دفعِ شر کی راہیں کھلی ہوں‘ لیکن اِس وقت انسانوں کے برے اعمال کے سبب طلبِ خیر کے دروازے بند ہیں اور شر کے راستے کھلے ہوئے ہیں‘ جس کی وجہ سے تقریباً پوری دنیا میں افراتفری‘ بے چینی‘ قتل وغارت‘ ناانصافی اور ظلم وتشدد ہے۔ گویا قرآن حکیم کی یہ آیت موجودہ حالات کا بالکل صحیح نقشہ کھینچ رہی ہے کہ:

﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ اَيْدِي النَّاسِ لِيُذِيْقَهُمْ بَعْضَ الَّذِيْ عَمِلُوْا لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴿۴۱﴾﴾ (الروم)

’’بر و بحر میں لوگوں کے اعمال کے سبب فساد رونما ہو گیا ہے‘ تاکہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے بعض اعمال کا مزہ چکھائے‘ شاید کہ وہ باز آجائیں۔‘‘

انسانیت اس بدامنی اور بے چینی سے اس قدر پریشان ہے کہ آج کا سب سے بڑا مسئلہ دہشت گردی اور بدامنی ہی سمجھا جا رہا ہے اور اس ضمن میں اسلام کے تصورِ جہاد کو دہشت گردی قرار دیا جا رہا ہے۔ قرآن حکیم کے بارے میں یہ خیال عام کیا جا رہا ہے کہ یہ جنگ وجدل اور بدامنی کا درس دیتا ہے‘ حالانکہ قرآن حکیم کا پیغام ہی فتنہ وفساد اور بدامنی کو ختم کرنا اور امن و سلامتی کو فروغ دینا ہے۔

قرآن مجید میں امن وسلامتی کی اس قدر اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کو امن کا گہوارہ بنا دیا‘ جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمت کے طور پر ذکر کیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا وَّيُتَخَطَّفُ النَّاسُ مِنْ حَوْلِهِمْ﴾

(العنکبوت:٦٧)

’’کیا یہ نہیں دیکھتے کہ ہم نے (بیت اللہ کو) ایک پُر امن حرم بنا دیا ہے‘ حالانکہ ان کے گرد وپیش سے لوگ اُچک لیے جاتے ہیں‘‘۔

نبی کریمﷺ نے بھی فتح مکہ کے موقع پر کفار و مشرکین کے لیے بیت اللہ کو امن کے مقامات میں سے ایک اہم مقام قرار دیا۔

دیگر حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کے سامنے بھی امن وسلامتی کی اہمیت مخفی نہ تھی‘ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مکہ مکرمہ کو امن کا شہر بنانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا کی تھی:

﴿رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا﴾ (البقرۃ:۱۲۶)

’’اے پروردگار! اس جگہ کو امن کا شہر بنا۔‘‘

خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ التین میں مکہ مکرمہ کے حوالے سے ’’امن والے شہر‘‘ کی قسم اُٹھائی: ﴿وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِيْنِ ۝۳﴾

قرآن حکیم کی بنیادی اصطلاحات میں سے ایمان اور اسلام دونوں امن وسلامتی کا مفہوم دیتی ہیں۔ امام راغبؒ کے نزدیک اسلام کے ایک معنی ’’الدُّخول فِی السِّلم‘‘ یعنی ’’امن وسلامتی اور صلح و آشتی میں داخل ہو جانا‘‘ کے ہیں اور قرآن میں بھی اسلام کے لیے لفظ ’’السِّلم‘‘ یعنی ’’سلامتی‘‘ وارد ہوا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (البقرۃ:۲۰۸)

’’اے اہل ایمان! اسلام (جو سراپا سلامتی ہے) میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔‘‘

اسی سے المُسلِم (مسلمان) مشتق ہے‘ جسے ایک طرف تو اللہ تعالیٰ کے احکامات تسلیم کرنے والا ہونا چاہیے اور دوسری طرف اس کے ہاتھ اور زبان کے شر سے دوسرے لوگ محفوظ ہوں‘ جیسے مسلمانوں کا دستور ہے کہ دوسرے مسلمان کو السلام علیکم کہہ کر اپنی طرف سے دوسرے کی جان و مال اور آبرو کی ضمانت فراہم کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اسماءِ حسنیٰ میں سے دو نام السلام اور المؤمن‘ جو سورۃ الحشر (آیت ۲۳) میں وارد ہوئے ہیں‘ امن وسلامتی ہی کا پیغام دیتے ہیں۔ السلام کا ایک معنی ’’سلامتی دینے والا‘‘ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا دوسرا نام المؤمن امن سے مشتق ہے‘ جس کے معنی خوف سے محفوظ ہونا ہے‘ اور مؤمن وہ ہے جو دوسرے کو اَمن دے۔ اللہ تعالیٰ اس معنی میں المؤمن ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو امن دینے والا ہے۔ اس کی مخلوق اس خوف سے بالکل محفوظ ہے کہ وہ کبھی اس پر ظلم کرے گا۔ آنحضورﷺ کے اسماء مبارکہ میں سے بھی ایک نام ’’مؤمن‘‘ ہے۔

قرآن مجید کا تصورِ امن وسلامتی دنیا میں رائج تصورِ امن سے زیادہ وسیع ہے۔ رائج

تصورِ امن کے مطابق اُس ریاست کو پُر امن سمجھا جاتا ہے جہاں پر لوگوں کو خوراک، رہائش، علاج، تعلیم اور دیگر ضروریاتِ زندگی بآسانی میسر ہوں اور اس کے شہریوں کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ ہوں۔ قرآن مجید کا پیش کردہ تصورِ امن بھی یہی ہے، لیکن وہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کے ساتھ مشروط ہے۔ قرآن حکیم ایسی ریاست کو جو اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ کو تسلیم نہ کرے، فتنہ سے تعبیر کرتا ہے، چاہے وہ جدید دَور کی متمدن ترین ریاست ہی کیوں نہ ہو۔ اور ایسی ریاست اگر دین اسلام کے لیے خطرہ ہو اور مسلمانوں کے ساتھ جنگ برپا کرنے والی ہو تو اس کے خلاف اُس وقت تک جہاد و قتال کا حکم ہے جب تک وہ اللہ کے قانون کے مطابق اپنا نظام ڈھال نہ لے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ (الانفال:۳۹)

''اور ان لوگوں سے لڑتے رہو یہاں تک کہ فتنہ (یعنی کفر کا نظام) باقی نہ رہے اور دین کل کا کل اللہ تعالیٰ کا ہی ہو جائے۔''

اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام کے پیش کردہ نظامِ امن کا مقصد جہاں ایک طرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیتِ اعلیٰ کا اقرار ہے تو دوسری طرف عوام الناس کو وہ تمام سہولیات بہم پہنچانا بھی ہے جس کا ایک جدید فلاحی ریاست تقاضا کرتی ہے، کیونکہ اسلام روحانیت اور مادیت دونوں کی ترقی کا خواہاں ہے۔

امن تب ہی متأثر ہوتا ہے جب روحانیت اور مادیت میں توازن نہ ہو۔ امن کے ٹوٹنے کے اور بہت سے اسباب و وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن ان تمام میں مشترک کفر و شرک ہے، جیسا کہ احمد حسن نقوی اپنی کتاب ''فلسفۂ امن'' میں لکھتے ہیں:

''(بدامنی) کے بہت سے اسباب و محرکات بتائے جا سکتے ہیں اور بتائے گئے ہیں، جن کا مطالعہ 'ذہنی ورزش' کا اچھا سامان ہے، لیکن ان سارے اسباب میں جو امر مشترک نظر آتا ہے وہ کفر و شرک ہے۔ چونکہ کفر و شرک کے ساتھ ہی عقل انسانی اپنے فطری اور سیدھے راستے سے ہٹ جاتی ہے اور انسان پر ایک قسم کا جنون طاری ہو جاتا ہے اس لیے اس کا توازنِ دماغی باقی نہیں رہتا، اور چونکہ افعال و اعمال تمام تر یقین قلبی اور افکارِ دماغی کے تحت ہوتے ہیں، اس لیے کافر و مشترک ایسے اعمال و افعال کا مرتکب ہوتا ہے جو امن کو قائم نہیں رہنے دیتے۔''(۱)

اسی کفر کا ایک پہلو عقیدۂ آخرت کا انکار ہے، جو کہ انسانیت کا امن تباہ کرنے کا باعث

ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں آخرت کے واقع ہونے کی بار باریقین دہانی کرائی گئی ہے اور انسان کی سرکشی کا سبب آخرت پر کامل یقین نہ ہونے کو بتایا گیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ۝٦ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى ۝٧ اِنَّ اِلٰى رَبِّكَ الرُّجْعٰى ۝٨﴾ (العلق)

''ہرگز نہیں' انسان سرکشی کرتا ہے۔ اس بنا پر کہ وہ اپنے آپ کو بے نیاز دیکھتا ہے۔ (حالانکہ) پلٹنا یقیناً تیرے رب ہی کی طرف ہے۔''

تکبر وغرور اور خود کو سرچشمۂ قوت واقتدار سمجھنے کے رجحانات نے بھی انسان کے امن وسکون کو تباہ کیا۔ جیسا کہ فرعون کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

﴿اِنَّ فِرْعَوْنَ عَلَا فِى الْاَرْضِ وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُفْسِدِيْنَ ۝٤﴾

(القصص)

''بے شک فرعون نے زمین میں سرکشی کی اور اس کے باشندوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا' ان میں سے ایک گروہ (بنی اسرائیل) کو اُس نے کمزور بنا رکھا تھا' اس کے بیٹوں کو قتل کرتا تھا اور اس کی عورتوں کو زندہ رہنے دیتا تھا۔ یقیناً وہ فساد کرنے والوں میں سے تھا۔''

اسی بات کی ترجمانی کرتے ہوئے ایک مرتبہ مولانا مودودیؒ نے ریاست کپورتھلہ میں ہندوؤں' سکھوں اور مسلمانوں کے ایک مشترکہ اجتماع میں ''سلامتی کا راستہ'' کے عنوان سے تقریر کرتے ہوئے فرمایا:

''دنیا میں جتنی بدامنی پائی جاتی ہے اس کی ایک بڑی وجہ یہی ہے کہ جب تک انسان اپنے سے بالاتر کسی اقتدار کو تسلیم نہ کرے' اور جب تک اسے یقین نہ ہو کہ مجھ سے اوپر کوئی ایسا ہے جس کو مجھے اعمال کا جواب دینا ہے اور جس کے ہاتھ میں اتنی طاقت ہے کہ مجھے سزا دے سکتا ہے اُس وقت تک کسی طرح ممکن نہیں کہ ظلم کا دروازہ بند ہو اور صحیح امن قائم ہو سکے۔''(۲)

قرآن مجید خود امن کا علمبردار اور پیامبر ہے۔ ہم دیکھتے ہیں نزولِ قرآن سے قبل عرب کا معاشرہ بدامنی اور فساد کا نمونہ تھا۔ آدمی آدمی کے لیے بھیڑیا بنا ہوا تھا۔ طاقتور کمزوروں کو کھاتے جا رہے تھے' لیکن اللہ کی کتاب کے ذریعے سے نبی کریمﷺ نے اس بگڑے ہوئے

معاشرے کو پُرامن بنا دیا۔ یہ کتاب آج ہمارے لیے بھی یہی پیغام رکھتی ہے کہ:

﴿يَّهۡدِىۡ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ﴾ (المائدة:١٦)

''اللہ تعالیٰ اس (قرآن مجید) کے ذریعے انہیں سلامتی کی راہیں دکھاتا ہے جو اس کی خوشنودی کا اتباع کرتے ہیں۔''

سنن ترمذی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''عنقریب ایک بڑا فتنہ سر اُٹھائے گا۔'' حضرت علیؓ نے پوچھا: اس فتنے میں ذریعۂ نجات کیا ہوگا؟ تو آپؐ نے فرمایا: ''اللہ کی کتاب!'' (۳)

بدامنی اور فتنہ وفساد کے خاتمہ کے لیے قرآن حکیم کے پیش کردہ نظام کو سمجھنے سے قبل واضح رہے کہ امن وسلامتی کی دو سطحیں ہیں' ایک انفرادی اور دوسری اجتماعی۔ ایک فرد جس قدر امن و سکون میں ہوگا اسی قدر معاشرہ پُرامن ہوگا۔

انفرادی سطح پر ذہنی طور پر امن اسے ہی نصیب ہوگا جو ایمان باللہ کی دولت سے مالا مال ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ:

﴿اَلَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَلَمۡ يَلۡبِسُوۡۤا اِيۡمَانَهُمۡ بِظُلۡمٍ اُولٰٓـئِكَ لَهُمُ الۡاَمۡنُ وَهُمۡ مُّهۡتَدُوۡنَ۝۸۲﴾ (الانعام)

''جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے اپنے ایمان کو ظلم سے آلودہ نہیں کیا انہی کے لیے امن ہے اور وہی ہدایت یافتہ ہیں۔''

صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو اصحابِ رسول گھبرا گئے اور کہنے لگے: ہم میں سے کون ہے جس نے اپنی جان پر ظلم نہ کیا ہو؟ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تسلی دی:

لَيۡسَ هُوَ كَمَا تَظُنُّوۡنَ ، اِنَّمَا هُوَ كَمَا قَالَ لُقۡمَانُ لِاِبۡنِهٖ ﴿يٰبُنَىَّ لَا تُشۡرِكۡ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ﴾

''یہ ایسی بات نہیں جیسی تم سمجھ رہے ہو۔ یہ وہی بات ہے جو حضرت لقمان نے اپنے بیٹے کو سمجھائی تھی: ''اے میرے بچے! اللہ کے ساتھ کسی کو شریک مت کرنا۔ بے شک شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔'' (لقمان:۱۳)

اجتماعی سطح پر امن وسلامتی کا حصول نظامِ خلافت کے نفاذ کے بغیر کسی صورت ممکن نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنا قانون امن وامان قائم کرنے کے لیے ہی دیا ہے۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَیُبَدِّلَنَّھُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِھِمْ اَمْنًا ط﴾ (النور:۵۵)

(نظام خلافت قائم ہونے کی صورت میں) ''اللہ تعالیٰ ان کے خوف کو امن میں بدل دے گا۔''

قرآن حکیم امن وسلامتی کے قیام کے لیے مادّی اقدامات کی بھی راہنمائی کرتا ہے' جیسے ایک قوم نے ''ذوالقرنین'' سے درخواست کی کہ یاجوج وماجوج ہمارے امن کو متأثر کرتے ہیں اور زمین میں فساد کا باعث ہیں' آپ ہمیں ان سے نجات دلائیں' تو ذوالقرنین نے ان کے لیے ایک بند تعمیر کیا تاکہ یاجوج وماجوج اس کو عبور نہ کرسکیں اور متأثرہ قوم ان کے حملوں اور غارت گری سے محفوظ رہ سکے۔(قرآن حکیم میں اس کا ذکر سورۃ الکہف کی آیات ۹۳ تا ۹۸ میں ہے۔)

قرآن حکیم صرف نظامِ امن (شریعت) ہی پیش نہیں کرتا بلکہ امن کے تحفظ کے لیے بعض ضروری اقدامات بھی کرتا ہے' جیسے جو لوگ فساد فی الارض کی سعی کرنے والے اور اسلامی حکومت کو چیلنج کرنے والے ہیں' جن سے امنِ عامہ متأثر ہوتا ہے' ان کی سرکوبی کے لیے قرآن حکیم میں سخت سزائیں بیان کی گئی ہیں۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ط ذٰلِکَ لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَھُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ﴿۳۳﴾ اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْھِمْ ج فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۳۴﴾﴾ (المائدۃ)

''اُن لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے بغاوت کرتے ہیں اور ملک میں فساد برپا کرنے میں سرگرم ہیں' بس یہ ہے کہ عبرت ناک طور پر قتل کیے جائیں یا سولی پر لٹکائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹ ڈالے جائیں یا ملک سے باہر نکال دیے جائیں۔ یہ ان کے لیے اس دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے ایک عذابِ عظیم ہے۔مگر جو لوگ تمہارے قابو پانے سے قبل ہی توبہ کرلیں' تو سمجھ لو کہ اللہ مغفرت فرمانے والا اور مہربان ہے۔''

اس آیت میں وارد کلمات ﴿یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا﴾ سے مراد دو قسم کے جرائم ہیں۔ ایک وہ جن سے اسلامی ریاست میں قتل و غارت اور ڈاکہ زنی کے ذریعے بدنظمی پھیلتی ہے اور دوسرے وہ جن کا مقصد قوت کے ذریعے اسلامی نظام کو مٹا کر باطل نظام قائم کرنا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں ابن العربی اپنی تفسیر ''احکام القرآن'' میں ایک روایت یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ قبیلہ عکل اور عرینہ کے کچھ لوگ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور مسلمان ہو کر مدینہ میں رہنے لگے' مگر وہاں کی آب و ہوا انہیں موافق نہ آئی اور وہ بیمار ہو گئے۔ آنحضور ﷺ نے انہیں بیت المال کے اونٹوں کی چراگاہ میں بھیجا اور اونٹوں کا دودھ وغیرہ بطورِ دوا استعمال کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ لوگ اونٹوں کی چراگاہ میں پہنچے اور وہاں کچھ دیر رہے اور آنحضور ﷺ کے طبی مشورے پر عمل کرنے سے صحت یاب ہو گئے۔ لیکن صحت یاب ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے چرواہوں کو قتل کر کے اونٹوں کو ہانک کر لے گئے اور اسلام سے پھر گئے۔ ان کی اس حرکت کی جب آنحضور ﷺ کو خبر ہوئی تو آپؐ نے انہیں گرفتار کروا کر ان کے ہاتھ پاؤں کٹوائے' ان کی آنکھیں نکلوائیں اور انہیں دھوپ میں پتھریلی زمین پر چھوڑ دیا' یہاں تک کہ وہ مر گئے۔(۵)

یہ خیال قطعاً پیدا نہ ہو کہ یہ تو ظلم ہوا' بلکہ یہ سزا عین تقاضائے عدل و انصاف ہے' جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

((اِنَّمَا سَمَلَ النَّبِیُّ ﷺ اَعْیُنَ اُولٰٓئِکَ لِاَنَّھُمْ سَمَلُوْا اَعْیُنَ الرِّعَاءِ))(۶)

''نبی اکرم ﷺ نے ان کی آنکھوں میں سلائیاں پھیریں' کیونکہ انہوں نے بھی چرواہوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیری تھیں''۔

قرآن حکیم کے پیش کردہ تصورِ امن و سلامتی سے آپ کو خوب اندازہ ہو گیا ہو گا کہ قرآن ایک فرد کے امن و سکون سے لے کر عالمی امن کے قیام تک کا ایک جامع پروگرام رکھتا ہے۔ فرد کے امن و سکون پر اس لیے زور دیتا ہے کہ وہ عالمی امن کے قیام کی بنیادی اکائی ہے۔ فرد جس قدر پُرسکون اور پرامن ہو گا معاشرتی اور عالمی امن اسی قدر مستحکم ہو گا۔ اجتماعی حوالے سے قرآن صرف چند سزاؤں کی بنیاد پر ہی امن قائم نہیں کرنا چاہتا' بلکہ وہ ایک جامع پروگرام پیش کرتا ہے جس میں ایک شہری کی تمام ضروریات کا خیال رکھنا شامل ہے تاکہ وہ بدامنی پیدا

کرنے سے بچے۔ قرآن کا یہ تصورِ امن و سلامتی محض ایک تصور و خیال نہیں ہے‘ بلکہ دنیا میں اسے عملی طور پر آنحضورﷺ نے قائم کیا‘ جس کے نتائج وثمرات سے دورِ نبویؐ اور دورِ خلافتِ راشدہ میں تمام لوگ یکساں طور پر مستفید ہوئے۔ انسانیت اگر دوبارہ قرآن کے پیش کردہ تصورِ امن و سلامتی کی طرف رجوع کرے تو آج بھی دُنیا میں فتنہ وفساد کی بھڑکتی ہوئی آگ بجھ سکتی ہے۔

حواشی

(۱) احمد حسن نقوی‘ فلسفہ امن‘ ص ۹۔

(۲) سید ابوالاعلیٰ مودودی‘ سلامتی کا راستہ‘ ص ۲۸۔

(۳) سنن الترمذی‘ ابواب فضائل القرآن‘ باب ما جاء فی فضل القرآن۔

(٤) صحیح مسلم‘ کتاب الایمان‘ باب صدق الایمان واخلاصه۔

(٥) ابن العربی‘ احکام القرآن‘ ج۲‘ ص ۵۹۱‘۵۹۲۔ (یہ واقعہ صحیحین میں موجود ہے)

(٦) صحیح مسلم‘ کتاب القسامه‘ والمحاربین والقصاص والدیات‘ باب حکم المحاربین والمرتدین۔

استقامت

قرآن وحدیث کے حوالے سے

عتیق الرحمٰن صدیقی

الاِسْتِقَامَة (استفعال) کے معنی راستہ کے (خطِ مستقیم کی طرح) سیدھا ہونے کے ہیں اور تشبیہہ کے طور پر راہِ حق کو بھی صراطِ مستقیم کہا گیا ہے۔ چنانچہ فرمایا: ﴿**اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ**﴾ (الفاتحۃ) ''ہم کو سیدھے راستے پر چلا۔'' ﴿**وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا**﴾ (الانعام: ۱۵٤) ''اور یہ کہ میرا سیدھا راستہ یہی ہے۔'' ﴿**اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ**﴾ (ھود) ''بے شک میرا پروردگار سیدھے راستے پر ہے۔'' اور کسی انسان کی استقامت کے معنی سیدھی راہ پر چلنے اور اس پر ثابت قدم رہنے کے ہوتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا: ﴿**اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا**﴾ (حٰم السجدۃ: ۳۰) ''جن لوگوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ اس پر قائم رہے۔'' ﴿**فَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ**﴾ (ھود: ۱۱۲) ''سو (اے پیغمبر) جیسا کہ تم کو حکم ہوتا ہے اس پر قائم رہو۔'' ﴿**فَاسْتَقِيْمُوْا اِلَيْهِ**﴾ (حٰم السجدۃ: ٦) ''تو سیدھے اس کی طرف متوجہ رہو۔'' (مفردات القرآن' جلد دوم)

مولانا سید سلیمان ندویؒ استقامت کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''استقامت کے لفظی معنی سیدھا رہنے یا سیدھا چلے چلنے کے ہیں اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے۔ مشکلیں پیش آئیں' مخالفتیں ہوں' ستایا جائے' ہر خطرہ کو برداشت کیا جائے' مگر حق سے منہ نہ پھیرا جائے اور اس راستہ پر ثابت قدمی سے چلا جائے۔ حضور نبی کریم ﷺ کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے: ﴿**اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَاسْتَقِيْمُوْا اِلَيْهِ وَاسْتَغْفِرُوْهُ**﴾ (حٰم السجدۃ: ٦) ''تمہارا معبود ایک ہی ہے سو اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے گناہ بخشواؤ۔'' (سیرت النبی' جلد ششم)

سید احمد عروج قادری لکھتے ہیں کہ ''استقامت'' عربی میں کجی اور ٹیڑھے پن کی ضد کو کہتے ہیں یعنی کسی چیز کا سیدھا اور درست ہونا۔ طریق مستقیم اس راستے کو کہتے ہیں جو خطِ مستوی کی طرح سیدھا ہو۔ اس مناسبت سے دین اسلام کو صراطِ مستقیم کہا گیا ہے' یعنی وہ دین جس میں کوئی کج و پیچ' بے اعتدالی اور انحراف نہیں۔ (اسلامی تصوف)

"اگر کوئی انسان تادمِ زیست اسلام کی سیدھی راہ پر گامزن رہے اور کسی بھی حالت میں اس سے منحرف نہ ہو تو گویا وہ استقامت کی صفت سے متصف ہے۔ تصوف کی اصطلاح میں استقامت سلوک الی اللہ کی راہ میں اعتدال کی روش اپنا لینے کو کہتے ہیں' ایسا اعتدال جس میں کسی دوسری طرف جھکاؤ موجود نہ ہو۔ سلوک کے معنی یہ ہیں کہ مؤمن اللہ سے تعلق قائم کرنے کے لیے وہ راہ اختیار کرے جس پر نبی مکرمﷺ چلے تھے اور بدعت سے ہر لحظہ مجتنب رہے۔ استقامت صحیح معنوں میں اسے ہی نصیب ہوتی ہے جو شریعت سے مکمل آگاہ ہو اور نفسانی خواہشات کی مخالفت کرنے میں مضبوط ہو۔ حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا:

الاستقامة ان تستقیم علی الامر والنهی ولا تروغ روغان الثعالب
(تفسیر مظهری)

''استقامت یہ ہے کہ تم اللہ کے تمام اوامر ونواہی پر سیدھے جمے رہو اور اس سے ادھر ادھر راہِ فرار لومڑیوں کی طرح نہ نکالو۔''

مولانا مفتی محمد شفیعؒ اپنی تفسیر میں رقم طراز ہیں کہ:

''استقامت تو ایک لفظ مختصر ہے مگر تمام شرائع اسلامیہ کو جامع ہے' جس میں تمام احکاماتِ الٰہیہ پر عمل اور تمام محرمات ومکروہات سے اجتناب دائمی طور پر شامل ہے۔ تفسیر کشاف میں ہے کہ انسان کا رَبُّنَا اللّٰہ کہنا جب ہی صحیح ہو سکتا ہے جب کہ وہ دل سے یقین کرے کہ میں ہر حال اور ہر قدم میں اللہ تعالیٰ کا زیر تربیت ہوں' مجھے ایک سانس بھی اس کی رحمت کے بغیر نہیں آ سکتا اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ انسان طریق عبادت پر ایسا مضبوط و مستقیم رہے کہ اس کا قلب اور قالب دونوں اس کی عبودیت سے سرمو انحراف نہ کریں۔'' (معارف القرآن' جلد ہفتم)

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا تَتَنَزَّلُ عَلَیۡہِمُ الۡمَلٰٓئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوۡا وَلَا تَحۡزَنُوۡا وَاَبۡشِرُوۡا بِالۡجَنَّۃِ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ﴿۳۰﴾﴾ (حٰم السجدۃ)

''جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ نہ ڈرو نہ غم کرو اور خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔''

سید مودودیؒ اس آیت کریمہ کے تحت لکھتے ہیں:

''جن لوگوں نے کہا کہ اللہ ہمارا ربّ ہے اور پھر وہ اس پر ثابت قدم رہے یقیناً ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ یعنی محض اتفاقاً کسی اللہ کو اپنا ربّ کہہ کر نہیں رہ گئے اور نہ اس غلطی میں مبتلا ہوئے کہ اللہ کو اپنا ربّ کہتے بھی جائیں اور ساتھ ساتھ دوسروں کو اپنا ربّ بناتے بھی جائیں' بلکہ ایک مرتبہ عقیدہ قبول کر لینے کے بعد پھر ساری عمر اس پر قائم رہے' اس کے خلاف کوئی دوسرا عقیدہ اختیار نہ کیا نہ اس عقیدہ کے ساتھ کسی باطل عقیدہ کی آمیزش کی اور اپنی عملی زندگی میں بھی عقیدہ توحید کے تقاضوں کو پورا کرتے رہے۔'' (تفہیم القرآن' جلد چہارم)

سورۃ الاحقاف میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ قَالُوۡا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسۡتَقَامُوۡا فَلَا خَوۡفٌ عَلَيۡهِمۡ وَلَا هُمۡ يَحۡزَنُوۡنَ ۝۱۳﴾ (الاحقاف)

''بے شک جنہوں نے کہا ہمارا پروردگار اللہ ہے پھر وہ (اس پر) جمے رہے تو نہ ڈر ہے ان کو اور نہ وہ غم کھائیں گے۔''

یعنی جنہوں نے توحید پر استقامت اختیار کی اور ہر خوف وخطر سے بےنچنت ہو گئے' اللہ کے ہاں انہیں نہ تو کسی چیز کا غم ہو گا اور نہ خوف۔

ان آیاتِ کریمہ کی شرح اس حدیثِ نبویؐ سے مزید واضح ہو جاتی ہے جسے امام نوویؒ نے اربعین میں صحیح مسلم کے حوالے سے نقل کیا ہے:

عَنۡ اَبِیۡ عَمۡرٍو وَقِیۡلَ اَبِیۡ عَمۡرَةَ سُفۡیَانَ بۡنِ عَبۡدِ اللّٰهِ قَالَ : قُلۡتُ: یَا رَسُوۡلَ اللّٰهِ! قُلۡ لِیۡ فِی الۡاِسۡلَامِ قَوۡلًا لَا اَسۡئَلُ عَنۡهُ اَحَدًا غَیۡرَکَ' قَالَ : ((قُلۡ آمَنۡتُ بِاللّٰهِ ثُمَّ اسۡتَقِمۡ)) (۱)

''سفیان بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' وہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! مجھے اسلام سے متعلق ایسی بات بتائیے کہ پھر آپ کے بعد کسی اور سے مجھے پوچھنے کی

(۱) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب جامع اوصاف الاسلام۔

ضرورت باقی نہ رہے۔ آپؐ نے فرمایا: ''اعلان کر دو کہ میں اللہ پر ایمان لے آیا ہوں' پھر اس (بات) پر ڈٹ جاؤ۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور ارشاد فرمایا:

((قَدْ قَالَهَا النَّاسُ ثُمَّ كَفَرَ اَكْثَرُهُمْ، فَمَنْ مَاتَ عَلَيْهَا فَهُوَ مِمَّنِ اسْتَقَامَ))(۲)

''بہت سے لوگوں نے اللہ کو اپنا ربّ کہا مگر ان میں سے اکثر کافر ہو گئے۔ ثابت قدم وہ شخص ہے جو مرتے دم تک اس عقیدے پر جما رہا۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کی تشریح یوں کرتے ہیں: **لم يُشركوا باللّٰه شيئًا لم يلتفتوا الى اله غيره** ''پھر اللہ کے سوا کسی کو شریک نہ بنایا' اس کے سوا کسی معبود کی طرف توجہ نہ کی۔'' (ابن جریر) حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اپنے عمل کو اللہ کے لیے خالص کر لیا'' (کشاف) حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''اللہ کے عائد کردہ فرائض فرماں برداری کے ساتھ ادا کرتے رہے''۔ (کشاف)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایمان میں استقامت دیدنی تھی۔ انہوں نے ہر طرح کی مخاصمتوں' مخالفتوں اور مزاحمتوں میں بھی ایمان کا دیپ جلائے رکھا۔ کفار کی ستم رانیاں اور جفا کاریاں ان کے حوصلوں کو پست کرنے میں ناکام رہیں۔ عرب کی سرزمین اپنی تمام تر وسعتوں کے باوجود اہل ایمان پر تنگ کر دی گئی۔ وہ جسمانی اذیتوں سے دوچار کیے گئے' معاشی و معاشرتی مقاطعہ کا ہدف بنے' وطن سے بے وطن ہوئے' مگر ان کے پائے استقامت میں ذرہ بھر بھی لرزش رونما نہ ہونے پائی۔ غزوۂ احزاب کے سلسلے میں قرآن حکیم نے ان مردانِ کار کے عزم و استقلال اور استقامت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:

﴿اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ﴿۱۰﴾ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ﴿۱۱﴾﴾ (الاحزاب)

''جب وہ تم پر اوپر سے اور نیچے سے چڑھ آئے' جب خوف کے مارے آنکھیں پتھرا گئیں' کلیجے منہ کو آ گئے اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان کرنے لگے' اُس وقت ایمان لانے والے خوب آزمائے گئے اور بری طرح ہلا مارے گئے۔''

(۲) سنن الترمذی' ابواب تفسیر القرآن عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم' باب ومن سورة حٰم السجدة۔

ایمان لانے والوں میں وہ بھی تھے جو حضور نبی کریمﷺ کے سچے پیروکار تھے اور وہ بھی تھے جو نفاق کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور انہوں نے کمزوری کا مظاہرہ کیا۔ مگر جو حقیقی معنوں میں ایمان کی روشنی سے مستنیر تھے انہوں نے عزم وثبات اور کامل استقامت کا مظاہرہ کیا۔ قرآن حکیم نے بایں الفاظ ان کی تعریف وتوصیف فرمائی:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾﴾ (الاحزاب)

''ایمان لانے والوں میں ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے' انہوں نے اپنے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔''

یعنی کوئی اللہ کی راہ میں جان دے چکا ہے اور کوئی اس کے لیے تیار ہے کہ وقت آئے تو اس کے دین کی خاطر اپنے خون کا نذرانہ پیش کر دے۔

حق کی راہ دشوار اور کٹھن ہے۔ یہ پھولوں کی سیج ہرگز نہیں' کانٹوں کا بستر ہے ؎

یہ عشق نہیں آساں بس اتنا سمجھ لیجے
اِک آگ کا دریا ہے اور ڈوب کے جانا ہے

راہِ حق کے مسافر نامساعد حالات کی سنگینی کو خاطر میں نہیں لاتے' آلام ومصائب سہتے ہیں مگر اُف تک نہیں کرتے۔ وہ شمشیر وسناں کی دھاروں پر بھی حق وصداقت کا علم بلند رکھتے ہیں۔ ابتلاؤں اور آزمائشوں سے گزرتے ہیں مگر اپنے موقف پر قائم رہتے ہیں۔ بالآخر اللہ تعالیٰ انہیں سرخرو کرتا ہے اور فوز وفلاح سے ہمکنار کرتا ہے۔ اس اصول کو قرآن یوں بیان کرتا ہے:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَاْتِكُمْ مَّثَلُ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ط مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ مَتٰى نَصْرُ اللّٰهِ ط اَلَآ اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ ﴿۲۱۴﴾﴾ (البقرۃ)

''پھر کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت کا داخلہ تمہیں مل جائے گا حالانکہ ابھی تم پر وہ سب کچھ نہیں گزرا ہے جو تم سے پہلے ایمان لانے والوں پر گزر چکا ہے؟ ان پر سختیاں گزریں' مصیبتیں آئیں' ہلا مارے گئے' حتیٰ کہ وقت کا رسول اور اس کے ساتھ اہل ایمان چیخ اٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی؟ اُس وقت انہیں تسلی دی گئی کہ ہاں اللہ

کی مدد قریب ہے۔''

ہر دور میں اللہ کے باغی اور سرکش لوگوں نے انبیاء کرامؑ اور صالح بندوں کا راستہ روکا مگر انہوں نے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ اپنی جانیں جوکھوں میں ڈال کر بھی باطل سے رزم آرا رہے اور دین حق کو قائم کرنے کی بھرپور جدوجہد کی' دین کی راہ میں مزاحم قوتوں کا زور توڑنے کے لیے جسم و جان کی تمام تر قوتوں سے کام لیا' اور پھر کامرانی نے ان کے قدم چومے۔ قلتِ تعداد ان کے لیے کبھی سدِ راہ نہیں بنی' جذبۂ ایمانی نے ان کی راہ کو کشادہ کیا۔ طالوت کے مختصر لشکر نے ایک بڑے لشکر کو پسپا کیا۔ نبی مکرم ﷺ نے اگلوں کی استقامت کو اپنی اُمت کے سامنے نمونے کے طور پر پیش کیا۔ حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ہم نے حضور نبی کریم ﷺ سے اپنی مصیبتوں کا حال عرض کرتے ہوئے شکایت کی۔ جب کچھ صحابہؓ نے کفار کی سختیوں پر اللہ سے نصرت کی دعا کرنے کا مطالبہ کیا تو آپؐ نے فرمایا:

((قَدْ كَانَ مَنْ قَبْلَكُمْ يُؤْخَذُ الرَّجُلُ' فَيُحْفَرُ لَهُ فِي الْاَرْضِ فَيُجْعَلُ فِيهَا فَيُجَاءُ بِالْمِنْشَارِ فَيُوْضَعُ عَلٰى رَأْسِهٖ فَيُجْعَلُ نِصْفَيْنِ' وَيُمْشَطُ بِاَمْشَاطِ الْحَدِيْدِ مَا دُوْنَ لَحْمِهٖ وَعَظْمِهٖ' فَمَا يَصُدُّهٗ ذٰلِكَ عَنْ دِيْنِهٖ))(۳)

''تم سے پہلے لوگوں کا حال یہ تھا کہ ایک آدمی کو پکڑا جاتا' زمین میں گاڑا جاتا' آرا لایا جاتا اور اس کے سر پر رکھ کر اسے دو ٹکڑوں میں چیر دیا جاتا۔ اور لوہے کی کنگھیوں سے اس کے گوشت اور ہڈیوں کو نوچا جاتا لیکن یہ چیز بھی اس کو اس کے دین سے روک نہ سکتی۔''

حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ جو اس حدیث کے راوی ہیں' انہیں طرح طرح کی تکلیفیں دی گئیں۔ کوئلے جلا کر اس پر ان کو چت لٹایا گیا اور ایک شخص ان کی چھاتی پر پاؤں رکھے رہا کہ کروٹ نہ بدلنے پائیں' یہاں تک کہ کوئلے پیٹھ کے نیچے پڑے ٹھنڈے ہو گئے۔ (ابن سعد' جلد۳' تذکرہ خباب بحوالہ سیرت النبی' جلد ششم)

حضرت بلال رضی اللہ عنہ گرم جلتی ریت پر لٹائے جاتے۔ پتھر کی بھاری چٹان ان کے سینے پر رکھی جاتی' گلے میں رسّی باندھ کر زمین پر گھسیٹے جاتے اور کہا جاتا کہ اسلام سے باز آ جاؤ! اُس وقت بھی ان کی زبان سے اَحد اَحد ہی نکلتا تھا۔ قرآن مجید نے اَصحابُ الاخدود کا تذکرہ کیا

(۳) صحیح البخاری' کتاب الاکراہ' باب من اختار الضرب والقتل والھوان علی الکافر۔ و کتاب المناقب' باب علامات النبوۃ فی الاسلام۔

ہے۔ وہ پکے مسلمان تھے۔ یہودیوں نے انہیں اذیت دینے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ آخران کو گڑھے کھود کر آگ میں جھونک دیا گیا' مگر وہ دینِ حق سے برگشتہ نہ ہوئے۔ سورۂ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝١٤٦ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝١٤٧﴾

''اس سے پہلے کتنے ہی نبی ایسے گزر چکے ہیں جن کے ساتھ مل کر خدا پرستوں نے جنگ کی۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر پڑیں ان سے وہ دل شکستہ نہیں ہوئے' انہوں نے کمزوری نہیں دکھائی اور وہ (باطل کے آگے) سرنگوں نہیں ہوئے۔ ایسے ہی صابروں کو اللہ پسند کرتا ہے۔ ان کی دعا بس یہ تھی کہ اے ہمارے رب! ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما' ہمارے کام میں تیری حدود سے کچھ تجاوز ہو گیا ہو تو اسے معاف فرما' ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما!''

امام ابوالقاسم قشیریؒ کی معروف کتاب الرسالۃ القشیر یہ کی شرح کے حاشیے پر السید مصطفیٰ العروسی نے سورۂ ہود کی آیت ﴿فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ؕ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝١١٢﴾ ''پس (اے محمدﷺ!) تم اور تمہارے وہ ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان و طاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں' ٹھیک ٹھیک راہِ راست پر ثابت قدم رہو جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے اور (بندگی کی حدود سے) تجاوز نہ کرو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو اس پر تمہارا ربّ نگاہ رکھتا ہے۔'' کے ضمن میں نہایت جامع توضیح کی ہے' جسے ہندوستان کے نامور صاحب علم و قلم سید احمد عروج قادری نے اپنی مشہور کتاب اسلامی تصوف میں نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں نبی ﷺ کو جس استقامت کا حکم دیا گیا ہے اس کا تعلق عقائد سے بھی ہے جو حضور ﷺ اور تمام مسلمانوں کے درمیان مشترک ہیں اور ان اعمال سے بھی جو حضور ﷺ کے ساتھ خاص تھے' جیسے احکامِ شرعیہ کی تبلیغ' فرائضِ نبوت کی ادائیگی اور رسالت کی ذمہ داریاں کا تحمل۔ مختصر یہ کہ استقامت کا یہ حکم تمام اصلی و فرعی احکام اور تمام نظری و عملی کمالات کو شامل ہے اور اس بات کو بھی شامل ہے کہ احکام کی تعمیل سے اس طرح عہدہ برآ ہونا جیسا کہ حکم دیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کر دیا۔ (نتائج الافکار' ج ۳' ص ۱۲۶)

اہل ایمان کو جس استقامت کا حکم دیا گیا ہے' سورۂ ہود کی اگلی آیت اس کی مزید وضاحت کرتی ہے:

﴿وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ ۙ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۱۱۳﴾﴾

''ان ظالموں کی طرف ذرا نہ جھکنا ورنہ جہنم کی لپیٹ میں آ جاؤ گے اور تمہیں کوئی ایسا ولی وسرپرست نہ ملے گا جو تمہیں اللہ سے بچا سکے اور پھر کہیں سے تم کو مدد نہ پہنچے گی۔''

امام قشیری لکھتے ہیں کہ:

''استقامت وہ درجہ ہے جس سے شرعی اُمور کی تکمیل ہوتی ہے اور جس کے وجود پر تمام خیرات وحسنات کا حصول موقوف ہے۔ جس شخص کو استقامت نصیب نہیں ہوئی اس کی تمام کوششیں ضائع ہوئیں اور اس کا حال اس عورت جیسا ہوا جس کے بارے میں کہا گیا ہے: ﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا﴾(النحل:۹۲)

''اور اس عورت کی طرح نہ ہونا جس نے محنت سے سوت کاتا پھر اس کو توڑ توڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا''۔

فتنوں کے دور میں جبکہ باطل اور اہل باطل راہِ حق کے مسافروں کی راہ میں رکاوٹوں پر رکاوٹیں ڈالے جا رہے ہوں ایسے میں جب ایک شخص حق پر قائم رہتا ہے تو وہ نہایت خوش بخت اور سعادت مند ہے۔ اسے نبی کریمﷺ نے شاباش دی ہے:

عَنِ الْمِقْدَادِ بْنِ الْاَسْوَدِ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِﷺ يَقُوْلُ: ((اِنَّ السَّعِيْدَ لَمَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ' اِنَّ السَّعِيْدَ لَمَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ' اِنَّ السَّعِيْدَ لَمَنْ جُنِّبَ الْفِتَنَ' وَلَمَنِ ابْتُلِيَ فَصَبَرَ فَوَاهًا)) (ابوداؤد)

''حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی کریمﷺ کو ارشاد فرماتے سنا: بلاشبہ خوش نصیب ہے وہ شخص جو فتنوں سے محفوظ رہا' بلاشبہ خوش نصیب ہے وہ شخص جو فتنوں سے محفوظ رہا' بلاشبہ خوش نصیب ہے وہ شخص جو فتنوں سے محفوظ رہا —— لیکن جو امتحان اور آزمائش میں ڈالا گیا پھر بھی حق پر جما رہا تو اس کے کیا کہنے (ایسے آدمی کے لیے شاباش ہے)''۔

عصر حاضر کی میڈیا وار میں

خطبہ جمعہ کی اہمیت وافادیت

حافظ شعیب احمد ☆

قدیم زمانے میں دشمن قومیں باقاعدہ میدانِ جنگ میں باہم برسرِ پیکار ہوا کرتی تھیں اور آمنے سامنے (face to face) شمشیر وسناں کے ایک دوسرے پر وار کیے جاتے تھے۔ لیکن عصر حاضر میں میدانِ جنگ کئی دیگر نوعیتیں بھی اختیار کر چکے ہیں۔ اب حملہ آوروں کے اطوار بدل چکے ہیں۔ اب بری، بحری، اور ہوائی جنگوں کے ساتھ ساتھ، تہذیبی، ثقافتی، معاشی، فکری، نظریاتی اور خصوصاً میڈیا پر پروپیگنڈا کی جنگ بھی جاری ہے۔ یہ جنگیں خصوصاً اُمتِ مسلمہ اور ملتِ کفر کے درمیان لڑی جا رہی ہیں۔

عصر حاضر میں الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کا جائز وناجائز استعمال اپنے عروج پر ہے اور غیر مسلم اقوام اس کا مسلمانوں کے خلاف بھرپور انداز میں استعمال کر رہی ہیں، جبکہ ہم میڈیا وار میں تقریباً ناکام ہو چکے ہیں، اور مسلمانوں کے ہاتھ میں کسی حد تک کوئی فورم ہے تو وہ بھی اسلامی نظریات کی بیخ کنی کے لیے استعمال ہو رہا ہے۔ اس میڈیا وار کے ذریعے مسلمانوں کے رجحانات، مصروفیات ومشاغل، عقائد ونظریات، رسوم ورواج اور رہن سہن کے انداز تک کو بدلا جا رہا ہے۔ میڈیا کے اندر یہ طاقت ہے کہ یہ جھوٹ کو سچ ثابت کر دیتا ہے۔ اسے اگر جادوئی قوت (Magic Power) قرار دیا جائے تو غلط نہ ہوگا، کیونکہ اس کے طلسماتی اثر کے نتیجہ میں ''جنوں کو خرد'' اور ''خرد کو جنوں'' کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔ عالم کفر میڈیا کے ذریعے ہی مسلمانانِ عالم کو بدنام کرنے، انہیں دہشت گرد کے طور پر پیش کرنے، قرآن کو دہشت گردی کی کتاب اور دنیا بھر میں مسلم تحاریکِ آزادی کو دہشت گردی کی تحریکیں ظاہر (show) کرنے میں کافی حد تک کامیاب ہو گیا ہے۔

☆ ایم فل، علوم اسلامیہ، لیکچرار گورنمنٹ کالج پتوکی

مذکورہ صورتِ حال میں اُمتِ مسلمہ کو بھی اس میڈیا وار کا مقابلہ بھرپور انداز میں کرنا ہوگا۔ جدید ذرائع ابلاغ میں اخبار و جرائد' میگزین' ریڈیو' ٹی وی' انٹرنیٹ وغیرہ شامل ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے۔ لیکن اس کے برعکس اُمتِ مسلمہ کے یہاں آغازِ اسلام سے ہی ایک اہم ذریعہ ابلاغ خطبہ جمعہ کی صورت میں موجود رہا ہے' جس کے نہایت مناسب استعمال کی آج بڑی شدید ضرورت ہے' تاکہ ان فوائد کو سمیٹا جاسکے جن کے پیش نظر اس کو جاری کیا گیا تھا۔

پنجگانہ نماز کی صورت میں یوں تو ہر مسلمان کو روزانہ عبادتِ الٰہی کا موقع میسر آتا ہے' لیکن جمعہ کی زیادہ تاکید کی گئی ہے' جس کا فلسفہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہر ساتویں دن ایک لائحہ عمل بتایا جائے جس کی روشنی میں وہ آئندہ ہفتہ گزار سکیں اور اس کے ساتھ ساتھ تذکیر کا سلسلہ بھی جاری رہے۔ لیکن بدقسمتی سے مسلمان مجموعی طور پر نہ تو یومِ جمعہ کو کوئی اہمیت دینے کے لیے تیار ہیں اور نہ ہی خطبہ جمعہ کے سننے اور اس میں بیان کیے گئے اصول وضوابط کو دل و دماغ میں جگہ دینے کی کوئی شعوری کوشش کرتے ہیں (الا ماشاء اللہ)۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ علمائے کرام اور خطبائے عظام خطبہ جمعہ کی اس ابلاغی حیثیت سے ناواقف ہیں' اور جو واقف بھی ہیں تو ان کو اُمت کی اس زبوں حالی کا فکر دامن گیر نہیں ہے۔ خطبہ جمعہ کا مناسب اور موزوں استعمال رائے عامہ ہموار کرنے اور عامۃ الناس میں شعوری انقلاب برپا کرنے کا مؤثر ذریعہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اجتماعِ جمعہ اہل اسلام کا ایک ہفتہ وار تربیتی پروگرام ہے' جو اجتماعی سطح پر مسلمانوں کے اہم اجلاس کی صورت میں منعقد ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آخر وہ کون سے اسباب وعوامل ہیں جن کی بنا پر آج خطبہ جمعہ کی اہمیت وافادیت کا احساس دلوں سے محو ہوتا جا رہا ہے۔ ذیل میں اس کا ایک تفصیلی جائزہ پیش کیا جاتا ہے۔

خطبہ جمعہ میں لوگوں کی عدم دلچسپی کی درج ذیل وجوہات ہوسکتی ہیں:

(ا) مادّیت پرستی اور بے تحاشا مصروفیات

عصر حاضر میں مسلمانوں کی اکثریت ''وَھن'' یعنی دنیا سے محبت اور موت سے نفرت کی بیماری میں مبتلا ہے ﴿اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ﴾. آج مسلمان اس قدر مادیت پرست (Materialistics) ہو چکے ہیں کہ اذان کی صورت میں اللہ کے بلاوے پر ہماری کوئی توجہ نہیں ہوتی۔ اگر ہمیں کوئی بلاواطبقہ اشرافیہ میں سے کسی کی طرف سے آجائے تو ہم پھولے نہیں

سماتے۔ مادّیت پرستی کی اس دوڑ میں ہر کسی کو دنیا کا مال و متاع جمع کرنے' بینک بیلنس اور جاگیریں بنانے ہی کی فکر لاحق ہے۔ فکرِ فردا سے تو ہم کب کے غافل ہو چکے ہیں۔ دُنیوی امور سرانجام دینے کے لیے تو ہم وقت نکال سکتے ہیں لیکن عبادتِ الٰہی کے لیے ہفتہ وار ایک گھنٹہ نکالنے سے بھی ہم عاجز و قاصر نظر آتے ہیں۔ چنانچہ خطبہ جمعہ سننے کے لیے ہم اپنی بے تحاشا مصروفیات سے وقت نکالنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اگر کچھ لوگ خطبہ جمعہ سننے کے لیے مسجد میں حاضر ہوتے ہی ہیں تو بالکل آخری لمحات میں' جبکہ خطیب اپنی گفتگو کو سمیٹ رہا ہوتا ہے۔ ان عادات کے پیش نظر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی خطبۂ جمعہ میں عدم دلچسپی کی ایک اہم وجہ دنیا پرستی' بے پناہ مصروفیات اور اللہ کے عذاب سے بے خوفی ہے۔

(۲) فرقہ وارانہ اور روایتی قسم کے موضوعات پر گفتگو

خطبۂ جمعہ کے حوالے سے عوام الناس کی عدم دلچسپی کی ایک وجہ خطباء کرام کا روایتی قسم کے موضوعات پر گفتگو کرنا بھی ہے' جبکہ انسان کی فطری خواہش یہ ہے کہ وہ تازہ بتازہ معلومات سننا چاہتا ہے۔ اس میں تو کسی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ قرآن و حدیث میں کوئی کمی بیشی نہیں کی جا سکتی' اسے تو یقیناً من وعن بیان کیا جائے گا' لیکن بعض پہلوؤں کے اعتبار سے موضوعِ بحث میں جدت پیدا کی جا سکتی ہے' جس کا تفصیلی تذکرہ تجاویز کے ضمن میں کیا جائے گا۔

اس ضمن میں یہ امر بھی توجہ طلب ہے کہ علمائے کرام کی اکثریت خطباتِ جمعہ کے لیے چونکہ فرقہ وارانہ موضوعات کا انتخاب کرتی ہے اور ان پر انتہائی غیر محتاط انداز میں گفتگو کی جاتی ہے' لہٰذا یہ چیز بھی عوام کے لیے نفرت کا باعث بنتی ہے' نتیجتاً کئی لوگ محض نمازِ جمعہ میں شرکت کو ہی ترجیح دیتے ہیں' تاکہ انہیں اپنے افکار و نظریات کے خلاف گفتگو سننے کا موقع ہی نہ مل سکے۔

(۳) طویل دورانیہ پر مشتمل خطبۂ جمعہ

سامعین کی نفسیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے وعظ و نصیحت کرنا سنتِ نبویؐ ہے۔ سامعین طویل خطبے کو ناپسند کرتے ہیں اور ویسے بھی انسان فطرتاً زیادہ دیر تک کسی بات کو انہماک اور توجہ سے نہیں سن سکتا۔ اسی لیے رسول اللہ ﷺ نے مختصر خطبہ کو پسند فرمایا ہے اور اسے خطیب کی دانش مندی کی علامت قرار دیا ہے۔ حدیثِ مبارکہ میں ہے:

((اِنَّ طُوْلَ صَلَاةِ الرَّجُلِ وَقِصَرَ خُطْبَتِهٖ مَئِنَّـــةٌ مِنْ فِقْهِهٖ فَاَطِيْلُوا الصَّلَاةَ

وَاقْصِرُوا الْخُطْبَۃَ)) (۱)

''بلاشبہ نماز کو لمبا کرنا اور خطبہ کو مختصر کرنا خطیب کی فقاہت کی دلیل ہے' لہٰذا تم نماز کو طویل اور خطبہ کو مختصر کیا کرو!''

لیکن عصر حاضر کے بیشتر علماء و خطباء اس فرمانِ مبارک کو بالائے طاق رکھتے ہوئے سوا ڈیڑھ گھنٹے پر مشتمل خطبہ ارشاد فرماتے ہیں' جس کا نتیجہ یہ ہے کہ آغازِ خطبہ میں گنتی کے چند لوگ موجود ہوتے ہیں اور بیشتر حضرات لمبے خطبہ کی وجہ سے نماز کے وقت پہنچتے ہیں۔ کیا کسی ایک موضوع کی تمام تفصیلات و جزئیات کو ایک ہی خطبہ میں بیان کرنا کوئی شرعی مسئلہ ہے کہ اسے اگلے خطبہ جمعہ کے لیے مؤخر نہیں کیا جا سکتا؟ کیا یہ حقیقت نہیں کہ مختصر خطبہ سامعین کو طویل خطبے کی نسبت زیادہ دیر تک یاد رہ سکتا ہے؟ کیا رسول اللہ ﷺ نے باجماعت نماز کے لیے امام کو اپنے ضعیف و ناتواں' بیمار اور بوڑھے مقتدیوں کا خیال رکھنے کا حکم نہیں دیا؟ تو اس ضرورت کا احساس آخر خطبہ جمعہ کے حوالے سے کیوں نہیں کیا جاتا؟ دین کی یہ کیسی تبلیغ ہے کہ جس کے سبب لوگ دین کو پسند کرنے کے بجائے اظہارِ بیزاری کرنے لگیں؟

(۴) خطبہ جمعہ میں سورۂ قٓ پڑھنے پر اصرار

حضرت اُمّ ہشام بنت حارثہ بن نعمان رضی اللہ عنہا کہتی ہیں:

((مَا حَفِظْتُ قٓ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِیْدِ اِلَّا عَنْ لِسَانِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ﷺ یَقْرَؤُھَا کُلَّ یَوْمِ جُمُعَۃٍ عَلَی الْمِنْبَرِ اِذَا خَطَبَ النَّاسَ)) (۲)

''میں نے سورۂ قٓ کو نبی کریم ﷺ کی زبانِ مبارک سے سن سن کر یاد کیا جبکہ آپؐ اس سورۃ کی ہر جمعہ کو منبر پر قراءت کیا کرتے تھے۔''

اس حدیث کی بنیاد پر ایک نوخیز اور راہِ راست سے دُور گروہ (''جماعت المسلمین'' جو محض اپنے افرادِ جماعت کو ہی مسلمان اور باقی تمام فرق و مسالک کو خارج از اسلام سمجھتا ہے) کا کہنا ہے کہ ہر خطبہ جمعہ میں سورۂ قٓ کا پڑھنا ضروری ہے' ورنہ مخالفتِ سنت ہوگی۔ حالانکہ اس کا مقصد تو یہ ہے کہ سورۂ قٓ کے موضوعات کو زیر بحث لاتے ہوئے اس سورۃ کی تشریح و تفسیر مقامی زبان میں بیان کی جائے تاکہ لوگ اس سورۃ کا پیغام سمجھ کر کوئی سبق حاصل کریں' لیکن دین کے ناقص

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الجمعۃ' باب تخفیف الصلاۃ والخطبۃ۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب الجمعۃ' باب تخفیف الصلاۃ والخطبۃ۔

تصوراور سطحی فہم کی بنا پر سورۂ قٓ کو عربی میں ہر خطبہ جمعہ میں پڑھنے پر اصرار کیا جاتا ہے۔

(۵) جمعہ کی چھٹی کی منسوخی

اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ایک عرصہ تک سرکاری سطح پر یومِ جمعہ کو چھٹی کی جاتی تھی جس کی وجہ سے سرکاری ملازمین بہ آسانی وسہولت خطبۂ جمعہ میں شریک ہوتے تھے‘ مگر اب ایک عرصہ سے حکومت پاکستان نے اتوار کی چھٹی کرنے کا فیصلہ کر رکھا ہے جو تاحال نافذ العمل ہے اور اس کے نتیجہ میں سرکاری ملازمین کو خطبۂ جمعہ سے صحیح طور پر استفادہ کرنے میں کسی حد تک مشکل کا سامنا ہے۔

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اسلام میں چھٹی (Holiday) کا تصور بالکل نہیں ہے‘ بلکہ یہ قومِ یہود کا دیا ہوا تصور ہے‘ کیونکہ تورات میں یہ مذکور تھا کہ ’’خدا نے چھ روز میں زمین و آسمان کو بنایا اور ساتویں دن آرام کیا۔‘‘ (پیدائش ۲:۲) اگرچہ اب مسیحی پادریوں نے ’’آرام کیا‘‘ کو ’’فارغ ہوا‘‘ سے تبدیل کر دیا ہے (سید مودودی: تفہیم القرآن ۵:۱۲۵)۔ جبکہ قرآن اس بات کی یکسر نفی کرتا ہے‘ جیسا کہ اللہ ربّ العالمین ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ ﴿٣٨﴾﴾ (قٓ)

’’بے شک ہم نے زمین و آسمان کو اور ان کے درمیان کی چیزوں کو چھ دنوں میں پیدا کر دیا اور ہمیں کوئی تکان لاحق نہ ہوئی۔‘‘

سورۃ الجمعہ کی آیات ۹۔۱۰ کی رُو سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں اذانِ جمعہ سے قبل اور نمازِ جمعہ کے بعد بھی کاروبار کی اجازت دی ہے۔ تاہم پاکستان میں اسلامی تشخص کے پیش نظر جمعہ کے روز چھٹی کا مطالبہ ایک معقول بات ہے‘ کیونکہ سرکاری سطح پر ہفتہ وار ایک چھٹی کا فیصلہ کرنا ہی ہے تو پھر اسلامی تشخص کو نظر انداز کرنا یقیناً نامناسب ہے‘ لیکن سرکاری ملازمین کے لیے یہ عذر کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ ہم جمعۃ المبارک کی تعطیل نہ ہونے کی وجہ سے خطبہ سننے سے قاصر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جب اللہ کا ڈر دلوں میں ہو تو انسان بہرصورت اپنی ذمہ داریوں سے غفلت کا مظاہرہ نہیں کرتا۔

(۶) پابندیٔ وقت سے احتراز

اسلام ہمیں پابندیٔ وقت کا درس دیتا ہے۔ خصوصاً نمازوں کی بروقت ادائیگی اور روزہ

کے لیے مقررہ وقت پر سحری وافطاری دراصل پابندیٔ وقت کی ایک تربیت ہے۔ لیکن یہ بات نہایت معذرت سے لکھی جا رہی ہے کہ بعض علماء وخطباء کرام خطبہ جمعہ کے حوالے سے پابندیٔ وقت کا ثبوت نہیں دیتے' اور اکثر و بیشتر مقررہ وقت سے لیٹ ختم کرتے ہیں۔ عوام کی تاخیر سے آنے کا یہ ایک اہم سبب ہے۔ اکثر خطیب حضرات عوام کے تاخیر سے آنے کی شکایت کرتے ہیں' اور اسے خطبہ کے تاخیر سے ختم کرنے کا سبب قرار دیتے ہیں تاکہ لیٹ آنے والے بھی کچھ مستفید ہو جائیں' لیکن اس کے باوجود علماء کرام کو اصول پسند ثابت ہونا چاہیے۔ البتہ عوام الناس کو پابندیٔ وقت کی تلقین کرتے رہنا چاہیے۔

(۷) قوتِ گویائی وجوہرِ خطابت کا فقدان

اکثر مقامات پر عوام کی خطبہ جمعہ کے حوالے سے عدم دلچسپی کا سبب مقامی خطیب میں جوہرِ خطابت کا فقدان ہوتا ہے۔ اندازِ خطابت اگرچہ کسی حد تک مشق اور تکرار سے بہتر ہو جاتا ہے مگر بڑی حد تک یہ ایک وہبی صلاحیت ہے' لہٰذا سامعین کی توجہ بات کرنے والے کی بجائے بات پر ہونی چاہیے۔ جیسا کہ ایک قول ہے: ''**انظر الی ما یقول ولا تنظر الی من یقول**'' یعنی بات پر غور کرو نہ کہ بات کرنے والے پر۔

(۸) بعض علماء کرام کی بدعملی

بعض حضرات علماء کرام کے بارے یہ بدگمانی رکھتے ہیں کہ وہ خود تو عمل سے کورے ہوتے ہیں اور عوام کو خوب وعظ ونصیحت کرتے ہیں۔ ان کی اس بدگمانی کی وجہ بے شک علماء کا مشکوک کردار ہو سکتا ہے' لیکن اس کا یہ قطعاً مطلب نہیں کہ تمام علماء ہی بدعملی کا شکار ہیں۔ البتہ ایسے علماء جن کی بدعملی کی وجہ سے لوگ دین سے دور رہے ہوں ان کے لیے یہ بات یقیناً لمحہ فکریہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر قول وفعل میں تضاد کی بجائے یکسانیت ہو اور انسان کسی کو پند ونصائح کرنے سے قبل خود کو عمل کا خوگر بنائے تو یقیناً پھر وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کا ذکر شاعر نے یوں کیا ہے: ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں' طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

راقم الحروف کے والد محترم اکثر اس بات کا ذکر کیا کرتے ہیں کہ وہ ہر اسلامی ماہ کے

دوسرے جمعہ کو بنگہ بلوچاں نزد بھائی پھیرو میں حضرت حافظ محمد یحیٰ عزیز میر محمدی رحمۃ اللہ علیہ (م ۲۰۰۸ء) کا خطبہ جمعہ سننے کے لیے جاتے تھے اور ان کے بیان کی تاثیر ایک ماہ تک برقرار رہتی۔ پھر ایک ماہ کے بعد دوبارہ حاضری ہو جاتی اور پھر سے تقویت ایمان کا موقع مل جاتا۔ لہٰذا دیگر خطباء کو بھی ایسا ہی پرتاثیر خطبہ پیش کرنا چاہیے۔

تجاویز و لائحہ عمل

مذکورہ بالا اسباب جن کی وجہ سے خطبہ جمعہ کافی حد تک غیر مؤثر ہو کر رہ گیا ہے۔ اگر بنظر عمیق دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بیشتر اسباب کا تعلق خود علمائے کرام کے رویے سے ہے' لیکن اکثر و بیشتر علمائے کرام عوام کی مادّیت پرستی اور دُنیوی مصروفیات کی وجہ سے خطبہ جمعہ سے ان کی غیر حاضری یا عدم دلچسپی کے شاکی نظر آتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاں علماء کرام کو مثبت رویے کا مظاہرہ کرتے ہوئے مذکورہ بالا اسباب کا ازالہ کرنا چاہیے وہاں اس سلسلہ میں عوام کو بھی ذمہ داری کا ثبوت دینا چاہیے۔ عوام الناس کو بھی اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کو اہمیت دیتے ہوئے اپنا کاروبارِ زندگی (تجارت' زراعت' ملازمت وغیرہ) اذانِ جمعہ سے پہلے موقوف کر دینا چاہیے اور اپنی دینی غیرت وحمیت کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اہل ایمان سے مخاطب ہیں:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نُوْدِیَ لِلصَّلٰوۃِ مِنْ یَّوْمِ الْجُمُعَۃِ فَاسْعَوْا اِلٰی ذِکْرِ اللّٰہِ وَذَرُوا الْبَیْعَ﴾ (الجمعۃ:۹)

''اے ایمان والو! جمعہ کے روز جب (خطبہ و) نمازِ جمعہ کے لیے اذان دی جائے تو اللہ کی یاد کی طرف لپکو اور تجارت کو (فوراً) چھوڑ دو''۔

ایک مسلمان کا اللہ تعالیٰ پر کامل یقین اور اعتماد ہونا چاہیے کہ جس قدر رزق اللہ ربّ العزت نے اس کے لیے لکھ رکھا ہے وہ اسے ضرور مل کر رہے گا۔ خطبہ جمعہ کے دوران ہمارا کاروبارِ زندگی جاری رکھنا' اللہ پر ہمارے ناقص یقین واعتماد کی چغلی کھاتا ہے۔ ایک مسلمان کو تو ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ﴾ (الانعام) ''یقیناً میری نماز' میری قربانی' میرا جینا اور مرنا صرف اللہ ربّ العالمین کے لیے ہے''۔ کی عملی تصویر ہونا چاہیے۔ لیکن ہم ہیں کہ اسلام کے ہفتہ وار تربیتی واصلاحی پروگرام ''خطبہ جمعہ'' سننے کے لیے کچھ وقت کی قربانی بھی نہیں دے سکتے۔ یہ صورت حال انتہائی قابل افسوس ہے کہ ہم مسلمان یہ

اعتقاد و نظریہ بھی رکھیں کہ ہماری زندگی کا مالک فقط اللہ مالک الملک ہے اور پھر اس کے حکم کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس کی خاطر گھنٹہ بھر بھی نکالنے کے لیے بھی تیار نہ ہوں۔

ذی وقار علماء کرام و خطباءِ عظام کو بھی خطبۂ جمعہ کی ابلاغی اہمیت و افادیت کا صحیح ادراک ہونا چاہیے اور بالخصوص عصرِ حاضر میں اسلام کے خلاف کیے گئے پراپیگنڈے اور اسلامی تعلیمات پر کیے جانے والے اعتراضات و اشکالات کے بارے میں عوام الناس کے ذہن صاف کرنے چاہئیں اور ان کے طرزِ فکر (vision) کو درست سمت میں ڈالنا چاہیے' ورنہ بقول مولانا ابوالحسن علی ندویؒ (م ۲۰۰۰ء) مسلمانوں میں فکری ارتداد کے خطرات اِس وقت منڈلاتے نظر آ رہے ہیں (وَنَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنْ ذٰلِکَ)۔

ہماری نظر میں عوام کے خطبۂ جمعہ میں عدم دلچسپی کے اسباب میں سے سب سے اہم سبب خطباء کرام کا موضوعِ گفتگو کے انتخاب میں غیر ذمہ داری کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اکثر حضرات روایتی قسم کے موضوعات پر گفتگو کرتے نظر آتے ہیں اور بعض خطباء اپنے اپنے مسالک کی امتیازی خصوصیات کو ہی زیر بحث لاتے ہیں اور موضوعات کے ایک خاص دائرہ کے اندر ہی رہتے ہیں۔ مگر اب عصرِ حاضر کا جدید پڑھا لکھا طبقہ مزید بھی کچھ سننا چاہتا ہے اور بعض مخلص مسلمان اضافۂ علم کے فطری جذبہ کی تسکین چاہتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اب ارکانِ اسلام اور دیگر احکامِ شرعیہ کی فرضیت کے ساتھ ساتھ ان کا فلسفہ و حکمت بتانے کی بھی ضرورت ہے تاکہ عوام شعوری طور پر ان کی اہمیت و افادیت کے قائل ہو سکیں۔ اب معجزاتِ انبیاء کے بارے میں دلائل عقلیہ فراہم کر کے اشکالاتِ ذہنی دُور کرنے کی بھی فکر پیدا ہونی چاہیے۔ آج اسلامی تعلیمات کے بارے میں جدید میڈیکل و فزیکل سائنس کی تصدیقات کا تذکرہ بھی کرنا چاہیے۔

اسلامی تعلیمات کی عظمت و اہمیت کا احساس دلوں میں جاگزیں کرنے کا ایک دوسرا مؤثر طریقہ یہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی تعلیمات کو دیگر ادیان کے ساتھ تقابل کرتے ہوئے پیش کیا جائے۔ اس لیے کہ دیگر ادیان خواہ سامی ہوں یا غیر سامی' ان کی تعلیمات نہ تو اصلی حالت میں محفوظ ہیں اور نہ ہی انسانی زندگی کے جمیع پہلوؤں کا مکمل احاطہ کرتی ہیں' لہٰذا اس تقابل سے لامحالہ تعلیماتِ اسلامیہ کی اہمیت و افادیت میں اضافہ ہو گا' کیونکہ: ''**الاشیاء تُعرف باضدادھا**'' یعنی کسی چیز کی صحیح پہچان اُس وقت ہوتی ہے جب اسے اس کی مخالف شے کے

ساتھ رکھ کر دیکھا جائے۔ احکامِ شرعیہ کی فلاسفی بیان کرنے سے ذہنوں میں پائے جانے والے اشکالات و اعتراضات کا ازالہ ہوگا اور اسلام کے تقابلی مطالعہ سے اسلامی تعلیمات کی عظمت کا احساس ہوگا۔ ان دو فوائد کے علاوہ اس طرزِ خطابت کا تیسرا فائدہ یہ ہوگا کہ لوگوں کی اضافہ علمی کی فطری خواہش کی تسکین بھی ہوگی اور ان کی ذہنی بوریت بھی دور ہو سکے گی۔

ایک سمجھ دار اور کامیاب خطیب کی خطابت کا راز اس میں ہے کہ اس کی گفتگو عصری حالات سے بھی متعلق (related) ہو اور اس میں عوام کو کچھ لائحہ عمل بھی دیا گیا ہو۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اپنے گرد و پیش کے حالات‘ منفی رویوں اور سیاسی صورتحال کے بارے میں بھی عوام الناس کو رہنمائی (guide line) دی جائے۔ البتہ ایک داعی کو ایسا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے کہ وہ کسی خاص گروہ کی بے جا طرفداری کرے اور دیگر جماعتوں کے خلاف کچھ ایسے ناروا اور نامناسب الفاظ استعمال کرے کہ جس سے عوام متنفر ہو جائیں۔ مزید وضاحت کے لیے عرض ہے کہ اگر ملک میں ہنگامی نوعیت کے حالات ہوں‘ مثلاً زلزلہ‘ طوفان‘ سیلاب ‘ الیکشن کا موقع ہو‘ لوگ خودکشیاں اور خودسوزیاں کر رہے ہوں یا اپنے بچوں کی نیلامی کرتے پھر رہے ہوں تو اس طرح کے حالات کو بھی زیر بحث لا کر عوام کو مثبت رہنمائی دی جائے۔ اس طرح ان کی اس منفی سوچ کا ازالہ کرنا چاہیے کہ علماء حضرات کی اپنے گرد و پیش پر کوئی نظر نہیں ہوتی۔ واضح رہے کہ ان موضوعات پر گفتگو محض اس غلط فہمی کے ازالے کے لیے ہی نہیں کی جانی چاہیے بلکہ یہ علماء کی ذمہ داری بھی ہے کہ وہ ایسے مواقع پر بھی عوام کی صحیح رہنمائی کریں۔ خلاصۃً یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ خطیب کی گفتگو کسی کرنٹ ایشو (Current Issue) پر ہونی چاہیے جس سے سامعین کو یوں لگے گویا یہ تو ان کا اپنا ہی موضوع اور مسئلہ ہے جس پر ان کی راہنمائی کی جا رہی ہے۔ اس سے یقیناً سامعین کی دلچسپی میں اضافہ ہو سکے گا۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ آخر لوگ ٹی وی چینلز کے پروگراموں ’’کیپیٹل ٹاک‘‘ (Capital Talk) ’’پچاس منٹ‘‘، ’’گریٹ ڈیبیٹ‘‘(Great Debate) ، ’’آج کل‘‘ اور ’’کالم کار‘‘ وغیرہ کو کیوں اتنی اہمیت دیتے ہیں اور اس کے لیے بے تاب رہتے ہیں۔ اس کی وجہ دراصل یہی ہے کہ ان پروگراموں میں کسی کرنٹ ایشو پر بات کی جاتی ہے۔ خطبۂ جمعہ کو مؤثر بنانے کے لیے بھی ضروری ہے کہ علماء کرام بھی کرنٹ ایشوز پر بات کریں۔ لیکن اس کا یہ مطلب قطعاً نہ لیا جائے کہ خطبۂ جمعہ کو محض ایک سیاسی تقریر کا رنگ دے دیا جائے۔ یہ بات بھی

مشاہدہ میں آئی ہے کہ بعض جو شیلے نو جوان خطباء حکومتِ وقت کی غلطیوں کے بارے میں عوام الناس کو خبردار کر رہے ہوتے ہیں اور حکمرانوں کو بُرا بھلا کہہ کر بات ختم کر دیتے ہیں' حالانکہ جہاں ایک مناسب انداز میں عوام کو حکمرانوں کے غلط اقدام سے باخبر رکھنا ضروری ہے وہاں عوام کو اگر کچھ مناسب لائحہ عمل نہ بتایا جائے جو ان کی دسترس میں بھی ہو تو اس موضوع پر گفتگو کا صحیح حق ادا نہ ہو سکے گا۔ لہٰذا اس پہلو کو مدنظر رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔

اور یہ بات تو بالکل سامنے کی ہے کہ خطباء عظام اگر احکامِ شرعیہ کی فلاسفی' اسلامی تعلیمات کو تقابلی انداز میں پیش کرنا اور کسی کرنٹ ایشو پر بات کرنا چاہیں گے تو اس کے لیے یقیناً انہیں وسیع المطالعہ بھی ہونا ہوگا' اور کثرتِ مطالعہ کی حیثیت تو اہل علم کے لیے ایک قیمتی زیور کی ہے جس کی بدولت وہ اپنے علم کو مزید آراستہ و پیراستہ کرتے رہتے ہیں۔ اس سلسلہ میں علماء کرام کے لیے ہمارا مشورہ ہے کہ وہ اخبارات اور دینی کتب کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ عصری اسلامی رسائل وجرائد کے مطالعہ کو بھی یقینی بنائیں' کیونکہ ان رسائل وجرائد سے تازہ علمی وفکری غذا ملتی ہے اور یہی غذا آگے عوام تک منتقل کرنا ضروری ہے تاکہ ایمان وعمل کو جلا ملتی رہے۔ طرزِ خطابت کی اس خوشگوار تبدیلی سے علماء کرام کو وسعت علمی کی نعمت بھی میسر ہو سکے گی۔

خطبہ جمعہ کو مؤثر بنانے اور لوگوں کی تعداد (gathering) کو یقینی بنانے کے لیے ایک تجویز یہ بھی ہے کہ اگر عوام کو پیشگی آئندہ کے خطبہ جمعہ کا موضوع بتا دیا جائے تو اس سے بھی غالباً لوگ دلچسپی کا مظاہرہ کریں گے۔ ان تمام مساعی کے ساتھ ساتھ بندۂ مؤمن (خطیب) کا اصل ہتھیار دعا ہے کہ وہ اللہ کے حضور دست بدعا ہو کہ اللہ اس کی زبان کی گرہ کھول دے تاکہ بات کو صحیح سمجھا سکے۔ (سورۂ طٰہٰ: ۲۷'۲۸) اور اپنی گفتگو کے مؤثر ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ سے اضافۂ علم وعمل اور خلوص کی بھی دعا کرتا رہے۔ علاوہ ازیں اس دعا کو بھی اپنی جملہ دعاؤں کا حصہ بنا لے کہ اللہ ربّ العالمین اس کے سامعین کے دل پھیر دے اور انہیں دین کا صحیح فہم و بصیرت عطا فرمائے' کیونکہ افراد کے قلوب اُسی ذاتِ یکتا کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ **اَللّٰھُمَّ یَامُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا اِلٰی طَاعَتِکَ**. آمین!

آخر میں راقم الحروف معزز علماء کرام وخطباء عظام کی خدمتِ عالیہ سے یہ اُمید رکھتا ہے کہ اس تحریر سے اگر کسی کو کچھ ناگواری محسوس ہوئی ہو تو عفو ودرگزر سے کام لیں گے (**والعفو عند کِرام النّاسِ مقبول**) کیونکہ یہ تحریر محض ﴿**اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ**﴾ کے جذبہ سے لکھی گئی ہے۔ ❁❁

شادیوں میں تاخیر۔ایک شیطانی دھوکہ

ڈاکٹر گوہر مشتاق (امریکہ)

مسلم معاشروں میں آج جو بیماریاں سر اٹھا رہی ہیں اُن میں سے ایک بیماری شادیوں میں بلاوجہ کی تاخیر ہے۔سوسائٹی میں اس مرض کے عام ہونے میں بہت سے عوامل ایک ساتھ کارفرما ہیں۔ اس میں اگر اپنوں کی سادگی کا دخل ہے تو غیروں کی ّعیاری بھی شامل ہے۔ مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی غیر مسلم طاقتوں کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی ہے۔ غیر مسلموں کے سازشی ذہن یہ جانتے ہیں کہ اگر مسلم معاشروں میں دیر سے شادیوں کا رواج عام ہو جائے گا تو ایک طرف معاشرے میں بے حیائی پھیلے گی اور دوسری طرف شادیوں میں تاخیر کی وجہ سے بچوں کی شرح پیدائش کم ہو جائے گی‘ کیونکہ عورتیں ایک مخصوص مدت (menopause) کے بعد بچے پیدا نہیں کر سکتیں اور مرد عمر بڑھنے کے ساتھ بچوں کو پالنے کی ہمت کھو دیتے ہیں۔

’’غیروں‘‘ کو یہ بات خوب معلوم ہے جو مشہور امریکی عمرانی سائنسدان کارل ولسن نے اپنی کتاب "Our Dance Has Tumed to Death" (مطبوعہ ۱۹۷۹ء) میں بیان کی تھی کہ ’’جب کسی سوسائٹی میں شادی اور فیملی کی اہمیت کو کم کر دیا جائے تو اُس کا زوال یقینی ہو جاتا ہے‘‘۔اسی طرح برطانوی علم الانسانیات (Anthropology) کے ماہر جے ڈی اَنون نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب "Sex and Culture" میں انسانی تاریخ کی چھیاسی (۸۶) تہذیبوں کا مطالعاتی جائزہ پیش کیا جو زوال کا شکار ہوئیں۔اَنون کے مطابق اُن تمام تہذیبوں کے انحطاط کی وجہ جنسی بے راہ روی تھی‘ جبکہ وہ قومیں جو شادی کی قدر کرتی ہیں ہمیشہ ترقی کرتی ہیں۔کارل ولسن کے مطابق جو تہذیبیں موت کا شکار ہوتی ہیں اُن کی بربادی میں شادی سے فرار کے علاوہ اُس زمانے کی تحریکِ نسواں کا بھی بہت دخل ہوتا ہے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلم معاشروں میں شادیوں میں تاخیر کے رجحان کو عام کرنے میں تحریکِ نسواں اور اُس کی معنوی اولاد یعنی NGOs کا بہت کچھ دخل ہے۔اس مضمون میں شادیوں میں تاخیر کے نقصانات کا

قرآن‘ حدیث اور جدید سائنسی تحقیقات کی روشنی میں تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں

قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ وَالصّٰلِحِیۡنَ مِنۡ عِبَادِکُمۡ وَاِمَآئِکُمۡ ؕ اِنۡ یَّکُوۡنُوۡا فُقَرَآءَ یُغۡنِہِمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ؕ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ ﴿۳۲﴾﴾

’’تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی غلاموں میں سے جو صالح ہوں‘ اُن کے نکاح کر دو۔ اگر وہ غریب ہوں تو اللہ اپنے فضل سے اُن کو غنی کر دے گا۔ اللہ بڑی وسعت والا اور علیم ہے‘‘۔

یہ آیات اُس دور میں نازل ہوئی تھیں جب حضرت عائشہ ؓ پر بہتان لگا تھا اور اللہ تعالیٰ نے ان کی براءت نازل فرمائی تھی۔ ان آیات کی تفسیر میں مولانا سید مودودیؒ تفہیم القرآن میں لکھتے ہیں کہ واقعۂ اِفک پر تبصرہ کرنے کے فوراً بعد یہ احکام بیان کرنا صاف طور پر یہ بتا رہا ہے کہ زوجۂ رسول جیسی بلند شخصیت پر ایک صریح بہتان کا اس طرح معاشرے کے اندر نفوذ کر جانا دراصل ایک شہوانی ماحول کی موجودگی کا نتیجہ تھا۔ اور اس کا علاج دیگر اصلاحات کے علاوہ یہ تھا کہ مردوں اور عورتوں کو زیادہ دیر تک مجرّد نہ رہنے دیا جائے اور ان کی شادیاں کر دی جائیں‘ کیونکہ تجرد فحش آفریں بھی ہوتا ہے اور فحش پذیر بھی۔ مجرد لوگ اور کچھ نہیں تو بری خبریں سننے اور پھیلانے ہی میں دلچسپی لینے لگتے ہیں۔

اسی طرح احادیثِ نبوی میں شادیوں میں تاخیر سے منع کیا گیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((یَا مَعۡشَرَ الشَّبَابِ ‘ مَنِ اسۡتَطَاعَ مِنۡکُمُ الۡبَاءَ ۃَ فَلۡیَتَزَوَّجۡ فَاِنَّہٗ اَغَضُّ لِلۡبَصَرِ وَاَحۡصَنُ لِلۡفَرۡجِ‘ وَمَنۡ لَمۡ یَسۡتَطِعۡ فَعَلَیۡہِ بِالصَّوۡمِ فَاِنَّہٗ لَہٗ وِجَاءٌ))[۱]

’’نوجوانو! تم میں سے جو شخص شادی کر سکتا ہو اُسے کر لینی چاہیے‘ کیونکہ یہ نگاہ کو بدنظری سے بچانے اور آدمی کی عفت قائم رکھنے کا بڑا ذریعہ ہے‘‘۔

حضرت ابوہریرہ ؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا:

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب النکاح‘ باب من لم یستطع الباءۃ فلیصم۔ وصحیح مسلم‘ کتاب النکاح‘باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسه الیه ووجد مؤنه۔

((ثَـلاثَۃٌ حَقٌّ عَلَی اللّٰہِ عَوْنُھُمْ : اَلْمُجَاھِدُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ‘ وَالْمُکَاتِبُ الَّذِیْ یُرِیْدُ الْاَدَاءَ‘ وَالنَّاکِحُ الَّذِیْ یُرِیْدُ الْعَفَافَ))(۱)

’’تین آدمی ہیں جن کی مدد اللہ کے ذمے ہے‘ ایک وہ شخص جو اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلے‘ دوسرے وہ مکاتب جو مال کتابت ادا کرنے کی نیت رکھے‘ تیسرے وہ شخص جو پاک دامن رہنے کے لیے نکاح کرے‘‘۔

ایک اور حدیث میں فرمایا:

((اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ فَمَنْ لَمْ یَعْمَلْ بِسُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ))(۲)

’’نکاح میری سنت ہے‘ پس جو میری سنت پر عمل پیرا نہیں ہوگا اُس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔‘‘

مزید فرمایا:

((فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ))(۳)

’’پس جو میری سنت سے منہ پھیرے گا اُس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں‘‘۔

جدید سائنسی تحقیق کی روشنی میں

اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے رشتے کو قرآن میں ایک نشانی قرار دیا ہے۔ اس حقیقت کو مغرب کے عمرانی سائنسدان کئی صدیوں کے بعد آج دریافت کر رہے ہیں۔ امریکی مفکر جارج گلڈر اپنی کتاب Man and Marriage (مرد اور شادی) میں لکھتا ہے کہ کسی بھی سوسائٹی میں کامیاب اور مشہور مرد وہی ہوتے ہیں جو شادی شدہ ہوتے ہیں‘ کیونکہ جب مرد شادی کر کے اپنے اندر کی مخفی بے پناہ صلاحیتوں کو عورتوں کی تخلیقی صلاحیت (motherhood) کے تابع کرتا ہے تبھی اس کی صلاحیتیں صحیح سمت میں گامزن ہوتی ہیں اور وہ ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ شادی مردوں میں اپنی فیملی کو چلانے کے لیے احساسِ ذمہ داری اور انفرادیت کا احساس پیدا

(۱) سنن الترمذی‘ ابواب فضائل الجھاد عن رسول اللہﷺ‘ باب ما جاء فی المجاھد والناکح والمکاتب ......

(۲) سنن ابن ماجہ‘ کتاب النکاح‘ باب ما جاء فی فضل النکاح۔

(۳) صحیح البخاری‘ کتاب النکاح‘ باب الترغیب فی النکاح۔ صحیح مسلم‘ کتاب النکاح‘ باب استحباب النکاح لمن تاقت نفسه الیه ووجد مؤنه۔

کرتی ہے اور بیوی کی محبت خاوند کو مہذب بناتی ہے۔ جارج گلڈر کے مطابق تحریک نسواں والے (اور NGOs) دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ وہ شادیوں کے خلاف نہیں' لیکن جب اُن سے پوچھا جائے کہ شادی کی تعریف بیان کریں تو وہ اس کا جواب دینے سے کتراتے ہیں۔ دراصل تحریک نسواں اور NGOs کا مقصد یہ ہے کہ فطرت نے دونوں جنسوں کو جو فرائض ودیعت کیے ہیں (مردوں پر معاشی ذمہ داریاں اور عورتوں پر گھر میں بچوں کی پرورش اور تربیت) اُن کو خلط ملط کر دیا جائے اور یوں معاشرے کی بنیادوں کو کھوکھلا کر دیا جائے۔ جدید سائنسی اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ شادیوں کی تاخیر میں بہت سے نقصانات پوشیدہ ہیں۔ چونکہ رشتہ مانگنے اور شادی کرنے کے معاملے میں عام طور پر سب سے زیادہ غفلت لڑکے والوں کی طرف سے ہوتی ہے (یعنی لڑکی کے والدین اُس کی شادی میں تاخیر کرتے ہیں) اس لیے اس کا نقصان بھی سب سے زیادہ لڑکے کو ہوتا ہے۔ غیر شادی شدہ مردوں کی زندگی مسائل اور حادثات کا مرکب ہوتی ہے' اور اگر وہ شادی نہ کریں تو اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ اُن کی زندگی کا اختتام اچھا نہیں ہوتا۔

تنخواہ کا موازنہ

مجرد اور شادی شدہ مردوں کی تنخواہوں میں بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔ امریکہ کے محکمہ محنت کی ۱۹۶۶ء کی ایک تحقیق کے مطابق مجرد مرد اور کنواری عورتوں کی سالانہ تنخواہوں میں کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح پچیس سال سے زیادہ عمر کے کالج گریجوایٹ غیر شادی شدہ مردوں اور عورتوں کی تنخواہوں میں ۱۹۶۹ء کی تحقیق کے مطابق کوئی تفاوت نہیں پایا جاتا تھا۔ اس کے برعکس ۱۹۸۳ء کی امریکہ کے Census Bureau کی رپورٹ کے مطابق شادی شدہ مرد کنوارے مردوں یا عورتوں سے ۸۰ فیصد زیادہ پیسہ کماتے ہیں۔ سوسائٹی میں سب سے زیادہ تنخواہ کمانے والے تقریباً ہمیشہ شادی شدہ مرد ہوتے ہیں۔ اسی بنا پر جارج گلڈر اپنی کتاب ''Man & Marriage'' میں ایسے کنوارے نوجوانوں کو جو زندگی میں ترقی کرنا چاہتے ہیں' یہ مشورہ دیتا ہے کہ وہ شادی کر لیں۔ واضح رہے کہ جارج گلڈر کوئی عام آدمی نہیں' وہ امریکہ کا چوٹی کا مفکر ہے' جس کی قابلیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُسے امریکی صدر رونلڈ ریگن کا سپیچ رائٹر ہونے کا اعزاز بھی حاصل تھا۔

کنوارے مرد اور نفسیاتی بیماریاں

کنوارے مردوں کا سب سے بڑا مسئلہ ان کی ذہنی اور جسمانی حالت ہوتی ہے۔ اگرچہ

مردوں کو نفسیاتی بیماریاں عورتوں کے مقابلے میں ویسے ہی زیادہ ہوتی ہیں‘ لیکن کنوارے مردوں کو یہ مسئلہ سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ امریکی ماہر عمرانیات جیسی برنارڈ نے اپنی کتاب The Future of Marriage (مطبوعہ نیویارک‘ ۱۹۷۳ء) میں جو تحقیقات پیش کی ہیں اُن کے مطابق ۲۵ سے ۶۵ سال کے درمیان کی عمر کے کنوارے مرد شادی شدہ مردوں یا عورتوں کے مقابلے میں ۳۰ فیصد ڈپریشن کا زیادہ شکار ہوتے ہیں اور اُن کے مقابلے میں دو گنا زیادہ ذہنی امراض (Neurosis) کے مریض بنتے ہیں۔ اسی طرح عورتوں یا شادی شدہ مردوں کے مقابلے میں کنوارے مرد تین گنا زیادہ نروس بریک ڈاؤن کا شکار ہوتے ہیں‘ تین گنا زیادہ بے خوابی کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں‘ اور اگر انہیں نیند آئے بھی تو تین گنا زیادہ ڈراؤنے خواب (Nightmares) دیکھتے ہیں۔ اسی طرح لیوسرول اور اس کے معاون سائنس دانوں نے اپنی تحقیق جس کا عنوان تھا: "Manhatton Suricy" میں جو اعداد وشمار جمع کیے ان کے مطابق تمام آبادی میں سے کنوارے مرد سب سے زیادہ ذہنی امراض کا شکار ہوئے تھے اور عمر کے ساتھ اُن کی حالت بد سے بدترین ہوتی جاتی تھی‘ حتیٰ کہ ۵۰ سے ۵۹ سال تک کی عمر تک پہنچتے پہنچتے تقریباً ۴۶ فیصد کنوارے مرد Mental Health Impairment کا شکار ہو گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکہ کے محکمہ اعداد وشمار کے ۱۹۸۰ء کے نتائج کے مطابق ذہنی امراض کے ہسپتالوں میں شادی شدہ مردوں کے مقابلے میں ۲۲ گنا زیادہ کنوارے مردوں کو داخل کیا جاتا ہے۔

کنوارے مرد اور جرائم

شادی شدہ زندگی اور بیوی بچے ایک مرد کو مہذب بناتے ہیں۔ اس کے برعکس جن نوجوانوں کی شادیوں میں والدین یا خاندان والے بلاوجہ تاخیر کرتے ہیں وہ کنوارے نوجوان جرائم کی دنیا کا رخ کر کے معاشرے کو اپنی مردانگی دکھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ امریکہ کی FBI کی شائع کردہ Uniform Crime Report (مطبوعہ واشنگٹن ڈی سی‘ ۱۹۸۰ء) کے مطابق اگرچہ چودہ برس سے زیادہ عمر کے کنوارے مرد آبادی کا صرف ۱۳ فیصد ہیں لیکن مجرموں میں ۴۰ فیصد کنوارے مرد ہوتے ہیں اور ان میں سے ۹۰ فیصد خطرناک قسم کے جرائم (قتل‘ ڈکیتی وغیرہ) کرتے ہیں۔ اسی طرح زنا بالجبر (rape) کے جرائم میں مجرد مرد شادی شدہ مردوں کے مقابلے میں پانچ گنا زیادہ ملوث ہوتے ہیں۔ اسلام کے ہر حکم میں حکمت ہے۔

قرآن نے چودہ سو برس پہلے سوسائٹی کو انہی جرائم سے بچانے کے لیے معاشرے کے لوگوں (یعنی والدین، اعزّہ واقارب وغیرہ) کو حکم دے دیا تھا کہ سوسائٹی کے کنوارے مردوں اور عورتوں کی شادیاں کر دیا کرو۔ لیکن افسوس کہ مسلمانوں نے قرآن کو عمل کی کتاب سمجھا ہی کب ہے! یہ تو چومنے، ختم کروانے، تبرک حاصل کرنے اور اس کی بے حرمتی کی صورت میں اس کے لیے جان قربان کر دینے کی کتاب ہے، عمل کی کیا ضرورت ہے؟

حادثاتی اموات اور کنوارے مرد

اگر حادثاتی اموات کا موازنہ کیا جائے تو سوسائٹی میں کنوارے مردوں کی شرح اموات سب سے زیادہ ہے، اور زیادہ تر یہ اموات خودکشی کی صورت میں ہوتی ہیں۔ اے وائن نے امریکہ کی پارلیمنٹ کے سامنے ۳۰ جولائی ۱۹۸۳ء کو رپورٹ پیش کی جس کے مطابق یہاں پر ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کے درمیان کنوارے مردوں میں خودکشی کی شرح میں ۱۵۴ فیصد اضافہ ہوا ہے اور عمر بڑھنے کے ساتھ کنوارے مردوں کا خودکشی کی طرف رجحان بڑھتا ہے۔ اسی طرح ایک دوسری تحقیق کے مطابق گاڑیوں کے حادثات اور دیگر بیماریوں کی وجہ سے کنوارے مردوں کی شرح اموات شادی شدہ مردوں کے مقابلے میں دوگنا ہوتی ہیں۔ یورپ کے انیسویں صدی کے مشہور ماہر عمرانیات ڈرک ہیم نے کنوارے مردوں میں خودکشی کی اموات کی زیادتی کے متعلق اپنی کتاب ''Suicide:A Study in Sociology'' (مطبوعہ نیویارک) میں لکھا تھا: ''کنوارے مرد کا سوسائٹی سے تعلق کمزور ہوتا ہے، اس لیے زندگی سے بھی اس کا تعلق کمزور ہوتا ہے''۔

مسلمان علماء کی نصیحت

مسلمان علماء یورپ کی سائنسی تحقیقات سے کئی صدیاں پہلے قرآن کے احکامات کی حکمتوں سے آگاہ تھے۔ مشہور ولی اللہ خاتون رابعہ بصریؒ کی وفات کا وقت جب قریب آیا تو انہوں نے اپنی مرید عورتوں کو قریب بلا کر فرمایا: ''میں تم سب عورتوں کو نصیحت کرتی ہوں کہ تم سب شادی ضرور کر لینا۔ میں نے زندگی میں شادی نہیں کی، لیکن جب میں رات کو عبادت میں مصروف ہوتی تھی اور باہر سے چوکیدار کی آواز آتی تھی تو کبھی کبھار میرا دل اس کی طرف مائل ہونے سے رک نہیں سکتا تھا''۔ (تذکرۃ الاولیاء)

برصغیر پاک و ہند کے بے مثال صوفی شیخ علی ہجویریؒ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''کشفُ المَحجُوب'' میں لکھا ہے کہ انہوں نے اس لیے نکاح نہیں کیا کیونکہ وہ تمام زندگی سفر میں رہے اور انہوں نے مسلمانوں کو نصیحت کی: ''اکیلا رہنے میں دو آفتیں ہیں: ایک سنتؐ کا ترک کرنا اور دوسرا اپنے اندر شہوت کو پالنا جو کسی وقت بھی اس کے لیے سخت آفت اور فتنے کا موجب بن سکتی ہے...... اور میں (علی ہجویری بن عثمان جلابی) خود اس میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ اس لیے اس کی تباہ کاری کو خوب سمجھتا ہوں۔ گیارہ سال تک میں نے نکاح نہیں کیا اور گناہ سے بھی بچا رہا مگر اس فتنہ میں میرا ابتلا ہونا اللہ نے میری تقدیر میں لکھ رکھا تھا۔ چنانچہ میں ایک پری صفت کا بن دیکھے اس درجہ دل و جان سے گرویدہ ہوا کہ ایک سال اسی میں مستغرق رہا۔ قریب تھا کہ میرا دین تباہ و برباد ہو جاتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے کمالِ لطف اور مہربانی سے میرے دل پر عصمت و پاکیزگی کا فیضان فرمایا اور اپنی رحمت سے مجھے اس آفت سے نجات بخشی''۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سے ایک مرتبہ کسی نوجوان نے پوچھا کہ کیا وہ مجرد رہ سکتا ہے' کیونکہ امام ابن تیمیہؒ اور خواجہ نظام الدین اولیاءؒ نے بھی تو شادی نہیں کی تھی؟ مولانا مودودیؒ نے جواب میں فرمایا: ''دیکھیں ہمارے پاس یہ جاننے کا کوئی ذریعہ موجود نہیں کہ ان حضرات نے کیوں شادی نہ کی۔ میں اُن کے اس عمل کی کوئی تاویل کر کے خواہ مخواہ اُمتِ مسلمہ کو گمراہ کرنے کا سبب نہیں بن سکتا۔ اگر آپ نکاح نہیں کرتے تو آپ اپنے اعضاء اور نظروں کو گناہ سے بچا بھی لیں مگر آپ اپنے خیالات کو شہوت کے اثرات سے نہیں بچا سکیں گے''۔

سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہما نے جب صوبہ سرحد میں اسلامی نظامِ خلافت کے قیام کی بنیاد رکھی تو وہاں سے ایک جاہلی رسم کو ختم کیا' جس میں وہاں کے لڑکی والے لوگ لڑکے والوں سے بھاری مقدار میں رقم وصول کیے بغیر اپنی بیٹیوں کا نکاح نہ کرتے تھے۔ اسی طرح جن لڑکیوں کا نکاح ہو جایا کرتا تھا' وہ بھی اسی انتظار میں کہ پٹھانوں کی رسوم کے مطابق رخصتی کا سامان ہو' برسوں بیٹھی رہتی تھیں' یہاں تک کہ بعض سن رسیدہ ہو جاتیں اور اس سے بہت سی قباحتیں پیدا ہوتیں۔ وہاں کی عورتوں نے سید صاحب سے انصاف کی درخواست کی۔ اس کے نتیجے میں سید صاحب نے یہ حکم نامہ جاری فرمایا کہ جن عورتوں کا نکاح ہو چکا تھا' تین دن کے اندر اُن کی رخصتی کر دی جائے' اور جو لڑکیاں بالغ ہو چکی تھیں اور ان کی شادی نہیں ہوئی تھی' ایک مہینے کے اندر اُن کا نکاح کر کے رخصتی کر دی جائے۔ سید صاحب نے یہ حکم اپنی حکومت میں سختی کے ساتھ نافذ فرمایا۔ (بحوالہ سیرت سید احمد شہید' از مولانا ابوالحسن علی ندویؒ)

بے اولاد کا طرزِ زندگی اور اس کے نقصانات

نبی مکرمﷺ نے فرمایا تھا کہ دجال بے اولاد ہوگا (صحیح مسلم) اس سے پتا چلتا ہے کہ دجال جس طرزِ زندگی کا علمبردار ہوگا اس کا منتہیٰ خاندانی نظام کی تباہی اور شادی کی ضرورت کا خاتمہ ہے۔ مغربی عمرانی سائنس دان پیٹرم سوروکن نے اپنی کتاب ''The American Sex Revolution'' میں امریکہ میں جنسی بے راہ روی کے معاشرتی زوال سے تعلق کا مطالعہ کیا اور یہ پیشین گوئی کی کہ فحاشی اور عریانی کو فروغ دے کر امریکہ 'انتحار بالرّضاء'' یا اپنی مرضی سے خودکشی (Voluntary Suicide) کا ارتکاب کر رہا ہے۔ سوروکن کے مطابق جب یہاں شادی کی اہمیت کو کم کیا جائے گا تو ہمارے معاشرے میں شرح پیدائش کم ہوجائے گی اور طلاقوں کی شرح بڑھ جائے گی۔ علاوہ بریں عیسائی ماہر عمرانیات کارل ولسن کے مطابق زوال یافتہ تہذیبوں کا مطالعہ کر کے ہم اُن میں چند مشترک خصوصیات پائیں گے۔ مثلاً مرد گھروں کا سربراہ بننا پسند نہ کریں' مرد اپنی فیملی کو نظر انداز کر کے مادی وسائل کے حصول کو زیادہ اہمیت دیں' عورتیں گھر میں ماں کے اہم کردار کو کمتر سمجھیں' عورتیں اور مرد خدا کی ذات پر یقین نہ رکھیں اور اپنی زندگیوں پر ایک اعلیٰ ہستی کی حکمرانی کا انکار کریں۔ جس سوسائٹی کے افراد میں ایسی خصوصیات پیدا ہوجائیں اُس کا صفحہ ہستی سے مٹ جانا یقینی ہوجاتا ہے۔

کیلیفورنیا کی سٹینفورڈ یونیورسٹی کے محقق ڈاکٹر سٹینلے کرٹز نے اپنے ایک تحقیقی مضمون میں جس کا عنوان تھا: "The End of Marriage in Scandinavia" یہ بتایا کہ سویڈن (Sweden) میں شادی کی شرح بہت تیزی سے گر رہی ہے۔ سویڈن کا شمار دنیا کے انتہائی سیکولر ممالک میں ہوتا ہے' اور سویڈش لوگ خود شادی کی گرتی ہوئی شرح کو یہاں کے سیکولرزم سے جوڑتے ہیں۔ بہت سی تحقیقات جو مغرب میں کی گئی ہیں اس کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ شادی کے شعبے کا تعلق معاشرے کے مذہب سے لگاؤ سے ہے۔ جہاں لوگ جتنے زیادہ مذہبی ہوں گے وہ شادی کو اتنی ہی زیادہ اہمیت دیں گے۔ (بحوالہ The Weekly Standard, Feb:2,2004) اس بات کو کارل ینگ جیسے ماہرین نفسیات نے بھی مانا ہے کہ مذہب زندگی کو ایک مقصد دیتا ہے اور اسی طرح شادی ایک نوجوان کے ذہن کو احساسِ ذمہ داری کے ساتھ ایک واضح سمت دیتی ہے۔ اسی لیے حدیث نبویؐ میں فرمایا گیا ہے کہ ''نکاح ایمان کو مکمل کرتا ہے''۔ اسی طرح طلاق خاندانی نظام کو تباہ کرنے میں سب سے اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اسی

لیے حدیث میں طلاق کو اللہ کے ہاں انتہائی ناپسندیدہ فعل قرار دیا گیا ہے۔ رسول اللہﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَی اللّٰہِ تَعَالَی الطَّلَاقُ))(۱)

''اللہ تعالیٰ کے نزدیک جائز کاموں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ فعل طلاق ہے۔''

ہمارے معاشروں میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ طلاق کا نقصان صرف عورت کو ہوتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ مردوں کو طلاق کا نقصان عورتوں سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ طلاق کے بعد عورتوں کے شادی کے امکانات انتہائی کم رہ جاتے ہیں اور معاشی لحاظ سے انہیں دھچکا پہنچتا ہے' لیکن مردوں کو طلاق کے نقصانات کی فہرست زیادہ لمبی ہے۔ دماغی امراض کے ہسپتالوں میں طلاق یافتہ مرد مریضوں کی تعداد طلاق یافتہ خواتین مریضوں کے مقابلے میں زیادہ ہو جاتی ہے۔ نیشنل بیورو آف ہیلتھ سٹیٹسکس (NBHS) کے اعداد و شمار کے مطابق ۳۵ سال سے ۶۵ سال کی عمر کے درمیان کے طلاق یافتہ مردوں کا شرح اموات طلاق یافتہ عورتوں کے مقابلے میں ساڑھے تین گنا زیادہ ہوتی ہے۔ (بحوالہ Marriage and Divorce مطبوعہ ہارورڈ یونیورسٹی' پریس ۱۹۷۶ء۔) اموات کی وجوہات بہت سی ہیں لیکن مجرد مردوں کی طرح طلاق یافتہ مرد بھی خواتین کے مقابلے میں ساڑھے تین گنا زیادہ خودکشی کا ارتکاب کرتے ہیں اور چار گنا زیادہ حادثات سے مرتے ہیں۔ اسی طرح جگر کے فیل ہو جانے کی وجہ سے ایسے مردوں کی اموات عورتوں سے تین گنا زیادہ ہوتی ہیں۔ اور سب سے اہم یہ کہ طلاق یافتہ مرد طلاق شدہ عورتوں کے مقابلے میں دل کے دورے کی وجہ سے چھ گنا زیادہ مرتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ طلاق سے نہ تو عورتوں کو فائدہ ہوتا ہے نہ مردوں کو۔ طلاق سے صرف شیطان کو فائدہ ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیثِ نبویؐ کے مطابق ابلیس (شیطان) سمندر پر اپنا تخت لگاتا ہے اور ہر شیطان اسے پورے دن کی کارروائی سناتا ہے۔ اس پر ابلیس کہتا ہے: ''تو نے کوئی بڑا کام نہیں کیا''۔ اتنے میں ایک شیطان اسے آ کر بتاتا ہے کہ ''میں نے دو میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ڈال کر دونوں میں طلاق دلوا دی ہے''۔ اس پر ابلیس اٹھ کر اس شیطان کو گلے لگا لیتا ہے اور سب کو بتاتا ہے کہ اس نے واقعتہً بڑا کام کیا ہے۔ شادی شدہ زندگی اور شادی کا بندھن مردوں عورتوں اور آنے والی نسلوں کی بقا کے لیے انتہائی ضروری ہے۔ اسی

---

(۱) سنن ابی داوٗد' کتاب الطلاق' باب فی کراھیة الطلاق۔

لیے سورۃ الروم میں میاں بیوی کے تعلق کو اللہ تعالیٰ کی نشانی قرار دیا گیا ہے۔

شادیوں میں تأخیر کا ایک اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُن میاں بیوی کے بچے جب پیدا ہوتے ہیں تو میاں بیوی خود بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان میں نوجوانوں والی ہمت اور طاقت نہیں رہتی۔ اس لیے وہ اپنے بچوں کی صحیح تربیت نہیں کر پاتے۔

افسوس کہ پاکستان کے مسلمانوں نے عیسائیوں سے رہبانیت لی اور ہندوؤں سے شادی کی بے جا رسومات جن کو نباہنے میں پیسے کا ضیاع ہوتا ہے۔ اگر گھر کے حالات اچھے نہ ہوں تو کئی والدین اُن ہندوانہ رسومات کی ادائیگی کی خاطر کسی معجزے کے انتظار میں بچوں کی شادی میں تأخیر کرتے چلے جاتے ہیں' حالانکہ یہ ظلم ہے۔ اسی تأخیر کی وجہ سے کئی لڑکے بدکاریوں میں ملوث ہو جاتے ہیں' لڑکیاں انٹرنیٹ پر نامحرم لڑکوں سے chatting کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اپنے اندر کے ہیجان کو ٹھنڈا کرنے کے لیے لڑکے پاپ میوزک اور لڑکیاں کلاسیکل میوزک سنتی ہیں' حالانکہ موسیقی روح کی غذا نہیں بلکہ سزا ہے۔ والدین یہ یاد رکھیں کہ چونکہ اپنے بچوں کی شادی اُن کی ذمہ داری ہے اس لیے اُن کے بچے اگر گناہ میں ملوث ہوں گے تو اس کا وبال ان والدین پر بھی ہوگا۔ حضرت ابوسعید خدریؓ اور حضرت ابن عباسؓ دونوں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ وُلِدَ لَـهُ وَلَدٌ فَلْيُحْسِنِ اسْمَهُ وَاَدَبَهُ' فَاِذَا بَلَغَ فَلْيُزَوِّجْهُ ' فَاِنْ بَلَغَ وَلَمْ يُزَوِّجْهُ فَاَصَابَ اِثْمًا فَاِنَّمَا اِثْمُهُ عَلٰى اَبِيْهِ))[۱]

''جس کسی کے ہاں بیٹا پیدا ہو تو وہ اس کا اچھا نام رکھے اور اس کی اچھی تربیت کرے۔ پھر جب وہ بالغ ہو جائے تو اُس کی شادی کر دے۔ اگر بلوغت کے بعد باپ نے اُس کی شادی نہ کی اور وہ کسی گناہ میں ملوث ہو گیا تو اس کے گناہ کا وبال اس کے باپ پر ہے۔''

ایک دوسری گمراہی جس کی طرف اشارہ ڈاکٹر شگفتہ نقوی نے اپنے ایک مضمون بعنوان ''ایک مچھلی اور سارا جل'' (بتول مئی ۲۰۰۶ء) میں کیا تھا اہم ہے کہ کس طرح لڑکیوں کے والدین انہیں عالمہ بنانے کی غلط فہمی میں اُن کی امیدوں کا خون کرتے ہیں اور انہیں بن بیاہے

---

(۱) رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔ بحوالہ مشکاۃ المصابیح' کتاب النکاح' باب الولی فی النکاح واستئذان المرأۃ۔

گھر بٹھائے رکھتے ہیں اور اس زعم میں مبتلا ہیں کہ وہ نیک کام کر رہے ہیں۔ اسی طرح پاکستان کے کچھ علاقوں میں لڑکیوں کی قرآن سے شادی کر دی جاتی ہے۔ یہ سب سراسر ظلم اور زیادتی ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ایسے مظالم پر NGOs کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ دراصل NGOs کا اصل مقصد گھر آباد کرنا ہوتا ہی نہیں۔ انہیں تو صرف خاندان توڑنے سے دلچسپی ہوتی ہے۔

بسا اوقات کچھ والدین کی اپنی شادیاں اُن کے ماں باپ نے تأخیر سے کی ہوتی ہیں تو وہ والدین اس چیز کو معمولی (normal) سمجھ کر (یا اس کا انتقام اپنے بچوں سے لینے کے لیے) اپنے بچوں کی شادیاں دیر سے کرتے ہیں‘ حالانکہ قرآن ہمیں کئی جگہوں پر یاددہانی کرواتا ہے:

> ’’اسی طرح تم سے پہلے جس بستی میں بھی ہم نے کوئی نذیر بھیجا‘ اس کے خوشحال لوگوں نے یہی کہا کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقش قدم کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہر نبی نے اُن سے پوچھا: کیا تم اسی ڈگر پر چلے جاؤ گے خواہ میں اس راستے سے زیادہ صحیح راستہ تمہیں بتاؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے؟‘‘ (الزخرف:۲۳‘۲۴)

حل یہاں ہے

بیسویں صدی کے عظیم مسلمان ماہر نفسیات ڈاکٹر مالک بدری اپنی کتاب ’’The AIDS Crisis‘‘ (مطبوعہ ملائشیا ۱۹۹۷ء) میں لکھتے ہیں کہ مسلمان ممالک میں شادیوں میں فضول خرچی اور ہندوؤں سے مستعار لی گئی جہیز کی رسم کی وجہ سے شادیوں میں بے انتہا تاخیر کی جاتی ہے‘ جس کی وجہ سے وہ نوجوان لڑکے جن کا ایمان کمزور ہوتا ہے وہ غلط کاموں میں پڑ کر ایڈز جیسی بیماریوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ڈاکٹر مالک بدری کے مطابق مسلم حکومتوں کو ایسی اصلاحات نافذ کرنی چاہئیں کہ شادیاں کرنا آسان ہو جائے۔ اس سے متعلق انہوں نے سوڈان کی اسلامی حکومت کی مثال پیش کی جس نے انیسویں صدی کے سوڈان کے مجدّدِ مہدی سوڈانی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے یہ روایت دوبارہ شروع کی کہ ہر سال رجب کی ۲۷ تاریخ کو شام کے وقت اجتماعی شادیاں ہوتی ہیں۔ اس تقریب میں ہزاروں سوڈانی نوجوان مرد اور عورتیں شادی کے بندھن میں بندھتے ہیں اور اس تقریب کے اخراجات کا ایک حصہ حکومت ادا کرتی ہے۔ اس تقریب میں سوڈان کے صدر کے علاوہ حکومت کے دیگر

معززینّ بہ نفس نفیس شرکت کرتے ہیں۔ حکومت ہر نوبیاہتے جوڑے کو کچھ پیسے اور کچھ فرنیچر شادی کے سفر کو شروع کرنے کے لیے اپنی طرف سے دیتی ہے۔ پاکستان کی حکومت کو بھی چاہیے کہ شادیوں میں صرف ون ڈش پر نظر رکھنے کی بجائے ایسی اصلاحات نافذ کرے کہ جن میں سستی اجتماعی شادیاں (Inexpensive Mass Weddings) اور نوبیاہتے جوڑوں کی مالی مدد سرکاری سطح پر ہو۔

تاہم جب تک حکومت یہ اصلاحات نافذ نہیں کرتی نوجوان لڑکوں لڑکیوں کے والدین کو ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھنا نہیں چاہیے۔ سورۃ النور کی آیت ۳۲ کا یہی مدّعا ہے کہ لوگ اپنے بچوں کی شادیاں کرنے کے معاملے میں بہت زیادہ حسابی بن کر نہ رہ جائیں۔ اس میں لڑکی والوں کے لیے بھی ہدایت ہے کہ نیک اور شریف آدمی اگر ان کے ہاں پیغام دے تو محض اس کی غربت دیکھ کر انکار نہ کر دیں یا اپنی بیٹی کو ''کیریئر'' کی بھینٹ نہ چڑھا دیں۔ لڑکے والوں کو بھی تلقین ہے کہ کسی نوجوان کو محض اس لیے نہ بٹھا رکھیں کہ ابھی وہ بہت نہیں کما رہا ہے۔ والدین کو نصیحت ہے کہ اپنے بیٹے کے لیے زیادہ جہیز والی لڑکی مت تلاش کریں اور اپنے بیٹے کو ''کیش'' مت کروائیں۔ اللہ سے دعا کریں کہ ان کے بیٹے کے ہاتھ پاؤں سلامت رہیں اور وہ خود کما کر اپنے بیوی بچوں کو کھلائے۔ یہ بھی یاد رکھیں کہ نئی آنے والی دلہن صرف دو روٹیاں کھائے گی۔ نیا آنے والا بچہ تو مزید دو تین سال تک روٹی بھی نہیں کھائے گا بلکہ صرف اپنی ماں کا دودھ پیئے گا۔ پھر خوف کس بات کا ہے؟ سورۃ النور میں نوجوانوں کو بھی نصیحت ہے کہ زیادہ بہتر حالات اور بینک بیلنس کے انتظار میں اپنی شادی کے معاملے کو خواہ مخواہ نہ ٹالتے رہیں۔ اس مضمون میں پیش کی گئی جدید ریسرچ بتاتی ہے کہ شادی کے بعد اللہ لوگوں کو اپنے فضل سے غنی کر دیتا ہے' اور اللہ کا وعدہ ہمیشہ سچا ہوتا ہے۔ oo